مقالات

یومِ رضا

حصّہ دوم

پیغامات

پیر صاحب بھرچونڈی شریف
علّامہ مفتی احمد یار خاں
علّامہ سید ابوالبرکات
سید ابوالاعلیٰ مودودی
ڈاکٹر سید محمّد حسن
حافظ مظہر الدین
محمّد ایوب قادری
رئیس امروہوی
بہزاد لکھنوی

مقالات

پیرزادہ کرم شاہ ازہری
علّامہ عبدالستّار خان نیازی
مولوی ابراہیم علی چشتی

ترتیب و تقدیم

قاضی عبدالنّبی کوکبؔ

دائرۃ المصنّفین ۸ ۔ اُردو بازار ۔ لاہور

ملنے کا پتہ: مُبارک سنز سٹیشنرز

مقالات یوم رضا

قدس سرہ العزیز
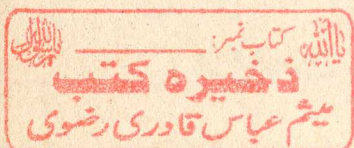
حصہ دوم

اعلیحضرت قدس سرہ کے پچاسویں عرس مبارک (یوم رضا
۲۵ صفر ۱۳۹۰ھ) کے موقع پر شائع کیگئی

قاضی عبدالنبی کوکب

○ کتاب : مقالات یومِ رضا حصّہ دوم
○ مرتّب : قاضی عبد النبی کوکب
○ کتابت : اعظم
○ مطبع : کنول آرٹ پریس - لاہور انارکلی
○ تاریخِ طباعت : ۲۵ ؍ صفر المظفّر ۱۳۹۰ھ ہجری
۲ ؍ مئی ۱۹۷۰ء
○ تعداد : ایک ہزار (طبع اوّل)
○ طابع و ناشر : محمد عارف قادری ایڈووکیٹ و عبد الرّسول عاؔمر
○ ھدیہ : اعلیٰ ایڈیشن ایک روپیہ پچاس پیسے
سستا ایڈیشن ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

دائرۃ المصنّفین / مبارک سنز سٹیشنرز ۸۔ اردو بازار لاہور

رہنمائے مندرجات

مقالات

پیغامات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مقالاتِ یومِ رضا" کے نام سے ایک کتاب آج سے دو سال قبل اس موقع پر شائع کی گئی تھی۔ جب لاہور میں مجلس صداقت اسلام کے زیرِ اہتمام "یومِ رضا" کی تقریب پہلی بار موثر انداز میں منائی گئی۔ اس تقریب اور اس کتاب نے جمود و تعصب کے دبیز پردے چاک کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے اس لئے اسے "مقالاتِ یومِ رضا" حصہ دوم" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

پہلی کتاب محترم مفتی اعجاز ولی خاں، حکیم محمد موسیٰ، عابد نظامی اور راقم السطور کے ان مقالات و مضامین پر مشتمل تھی جو "یومِ رضا" (۲ جون ۱۹۶۸ء) سے چند ہفتے پہلے اراکین مجلس کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ ان میں حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر (جو ناگپور کے "یومِ رضا" میں کی گئی تھی) اور بعض دیگر دلچسپ فیچرز شامل کر کے انہیں کتاب کی شکل میں فوراً چھاپ دیا گیا جو اس "یومِ رضا" کے موقع پر حاضرین کے ملاحظہ کیلئے موجود تھی مگر جو مقالات اجلاس میں پڑھے گئے وہ ابھی تک شائع نہیں کئے جا سکے تھے (ماسوا مفتی اعجاز ولی خاں کے مقالے کے) اسی طرح وہ پیغامات بھی ابھی تک میرے پاس امانت پڑے تھے جو ملک کے ممتاز اربابِ علم نے "یومِ رضا" کے سلسلے میں منتظمین کو ارسال کئے تھے۔ یہ زیرِ نظر کتاب (مقالاتِ یومِ رضا حصہ دوم)

انہی مقالات، انہی پیغامات اور اُس تاریخی "یومِ رضا" کی مفصل روئداد کو عوام تک پہنچانے کے لئے پیش کی جارہی ہے جس سے ملک بھر کے علمی و دینی حلقوں میں ایک زوردار تموّج پیدا ہو گیا تھا۔

پیغامات کو کتاب کے آخر میں رکھا گیا ہے اور ان کی اہمیّت کے بارے میں چند سطور وہیں درج کی گئی ہیں۔ انشاء اللہ یہ پیغامات عناد و تعصب کی تنگ نظریاں دور کرنے میں ہمارے مددگار ثابت ہوں گے۔ "یومِ رضا" کی روئداد کتاب کے آغاز میں ملے گی اور اس کے بعد سلسلۂ مقالات شروع ہوتا ہے۔

○

پیرزادہ محمّد کرم شاہ صاحب ازہری کا مقالہ جمال و کمال کا ایک مختصر مگر جامع مرقع ہے۔ انہوں نے شخصیّت (مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ) اور اس کے عہد کا تاریخی و سیاسی جائزہ اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ آغاز پر ہی شخصیّت اور عہد کے تقابلی مطالعے کی اہمیّت مقالہ نگار نے یوں واضح کر دی ہے۔

"انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اس کے عصری حالات جو فیصلہ کُن اثر ڈالتے ہیں وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ اپنے عصر کے تقاضوں سے منفعل اور متاثر ہوتے ہیں اور بعض لوگ خود ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے، اس کے زمانہ کے احوال سے صرفِ نظر قطعاً مستحسن نہیں۔ اس لئے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سُنّت مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات کو سمجھنے کے لئے آپ کے عہد کے مزاج کو سمجھنا اور ان تاریخی عوامل کا جائزہ لینا از حد اہم ہے جو اس وقت کارفرما تھے۔"

اس کے بعد اس مقالے میں اواخرِ عہدِ مغول کے قومی انحطاط، فرنگی سامراج کے تسلّط، علمائے حق کے آخری نعرۂ مستانہ (جہاد ۱۸۵۷ء) اور اس کی ناکامی کے

ساتھ انگریز کے انتقامی رویّے سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس ہیبت ناک خلا میں دین کے محاذ پر جو شخص پوری استقامت کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور کھڑا رہا۔ اسی کو اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مقالے میں امامِ اہلِ سُنّت کی علمی اور ملی خدمات پر بھی کچھ گفتگو کی گئی ہے۔

مولانا عبد الستار خان نیازی کا مقالہ اپنے موضوع کے کثیر گوشوں سے فکر انگیز انداز میں بحث کرتا ہے۔ انہوں نے بجا طور پر اس سوال کو اہمیت دی ہے کہ جب اکثر لیڈر اور علماء کا بھی ایک نمایاں طبقہ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک پر زور دے رہا تھا تو آخر عامۃ المسلمین اس تحریک کی مخالفت میں کیوں بضد ہو گئے تھے اور اُن کی اس ضد کا فکری منبع کہاں تھا؟

علامہ نیازی نے راسخ الاعتقاد علمائے اہل سنّت کی تبلیغ و تلقین کے سلسلے کو وہ سرچشمہ قرار دیا ہے جہاں سے امت کے فکری سوتے سیراب ہو رہے تھے اور اس راسخ الاعتقاد طبقہ علماء میں اس وقت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی مقامِ سیادت پر فائز تھے۔

مولوی ابراھیم علی چشتی (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے رحمتہ اللہ تعالیٰ) کی مختصر مگر وقیع تحریر انہی حقائق کی پُرزور تائید و تصدیق کرتی ہے جن پر علامہ نیازی کے مقالے کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ چشتی مرحوم نے امام اہل سنّت کو علم دین اور سیادت ملّی کا جامع قرار دیا ہے اور آپ کی خدمات کو "تحریک رسالت شناسی" کے حسین نام سے موسوم کیا ہے۔

۔ متاخرین میں بہت کم ہستیاں ایسی ہیں جو روحانی معارف کے ساتھ عقلی و نقلی

ؔ اس سوال و جواب کی مزید توضیح کیلئے ہمارا کتابچہ "دو قومی نظریہ اور علمائے اہل سنّت" بھی ملاحظہ ہو۔

علوم میں مہارت کاملہ حاصل کرسکیں۔ اعلیٰ حضرت ان معنوں میں جامع الصفات ہونیکے ساتھ ساتھ ربط عامہ کے لحاظ سے بھی یہ مقام رکھتے ہیں کہ برصغیر میں سواد اعظم کو ۱۸۵۷ء کے شاہ فضل الحق خیرآبادی کے فتوائے جہاد کے بعد اعلیٰ حضرت کی رسالت شناسی کی تحریک عامہ نے ہی ایک ملک گیر تنظیم میں جمع کیا"

○

یہاں میں اس کتاب کے مرتب کی حیثیت سے اپنے اس احساس کا اظہار کئے دیتا ہوں کہ اگر مقالہ نگار حضرات اور مرتب کو مزید وقت صرف کرنے کی گنجائش میسر آتی تو بعض مقالات کو واضح تر اور زیادہ مکمل بنایا جا سکتا تھا۔ علامہ نیازی سے تو میں نے ایک ملاقات میں اس خیال کا اظہار کر بھی دیا اور وہ اس تجویز سے اصولاً متفق ہو گئے تھے مگر ہمارے ملک میں ایک عرصے سے سیاسی حالات کی تیز رفتاری اور اس سے پیدا ہونے والے ہیجان نے ہم لوگوں سے سکونِ خاطر کے وہ لمحات چھین رکھے ہیں جن میں قرطاس و قلم کی طرف بہ اطمینان رجوع کیا جاتا ہے۔ خدا کرے کہ ہماری سیاست کی گاڑی ہموار شاہراہوں پہ چل نکلے اور اہل علم یکسوئی سے اپنے اصل میدان میں کام کر سکیں۔

○

تاہم زیر نظر موضوع پر اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو کام لیا ہے اس کی وقعت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض دوستوں نے غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی بناء پر اور بعض نے غالباً رشک و رقابت کے زیر اثر اس کام پر تنقید اور کسی حد تک مخالفت بھی کی مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مجلس صداقت اسلام کی ان خدمات سے اہل سنّت کے مقتدا مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہ العزیز کے معقول علمی تعارف کا آغاز ہو گیا ہے اس تعارف کی کامیاب اثر اندازی اس لئے بالیقین متوقع ہے کہ یہ تعارف ناروا قسم کی شخصیت پرستی اور معاندانہ و جاہلانہ تنگ نظری کی افراط و تفریط سے بفضلہٖ تعالیٰ پاک ہے۔

چنانچہ جب مجلس صداقت اسلام نے "یوم رضا" کا پروگرام اپنے خاص انداز میں مرتب کیا اور اس کی اطلاعات پریس میں بھجوائیں تو ملک کے پریس نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور "یوم رضا" کی اطلاعات اخبارات میں بار بار شائع ہوئیں پھر ۲۱ جون ۶۹ء (جب یوم رضا منایا جا رہا تھا) کی اشاعت میں متعدد اردو اخبارات نے اعلیٰ حضرت سے متعلق ہمارے بھجوائے ہوئے تعارفی مضامین اور فیچرز بھی شائع کئے اور اس کے بعد اجلاس "یوم رضا" کی مفصل رپورٹ بھی اردو اور انگریزی اخبارات میں طبع ہوئی۔

انہی پچھلے دو سالوں میں پنجاب یونیورسٹی میں بھی پہلی بار مولانا شاہ احمد رضا کی شخصیت اور ان کے کام کی طرف توجہ کی گئی۔ چنانچہ آپ کی سوانح، افکار و نظریات اور متعلقہ موضوعات پر دو مقالے ایم۔ اے کے طلبہ نے تحریر کر ڈالے ہیں[1]۔

ہماری آرزو اور جذبہ یہ ہے کہ ہم سلف کو محض بھاری بھرکم القاب و خطابات بخش دینے پر ہی کفایت کر کے نہ بیٹھے رہیں بلکہ ہم بھی علم اور تاریخ کے عصری رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے اعیان اہل سنت کی دینی ملی اور علمی خدمات کا عالمانہ اور مثبت انداز میں تعارف کرائیں۔ مولانا شاہ احمد رضا اور پاک و ہند میں ان کے ہم مشرب علماء و فقراء کی ہزاروں بلکہ لاکھوں تصانیف ابھی تک غبارِ خمول میں دبی پڑی ہیں کاش ہمارے ہاں بھی اللہ کے کچھ بندے ایسے اٹھ کھڑے ہوں جو اسلاف کا دیرینہ قرض چکانے کی خدمت سنبھال لیں۔

اس اعتبار سے ہمارا یہ کام محض ایک ننھا سا آغاز ہے اور اس کی حیثیت اس صدا کی ہے جو کسی قافلے کو جگانے اور آمادۂ سفر کرنے کیلئے بلند کی جا رہی ہو۔

۲ صفر ۱۳۹۰ھ ۹ اپریل ۱۹۷۰ء کوکب لاہور

---

[1] ان میں ایک مقالہ مولانا محمد صدیق اور دوسرا سید محمد فاروق القادری کا تحریر کردہ ہے۔ موخر الذکر نے علمی انداز میں بعض اختلافی مباحث پر بھی گفتگو کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجلاس "یوم رضا" منعقدہ ۲۔ جون ۱۹۶۸ء کی

مفصّل روئداد

یہ روئداد، روزنامہ "سعادت" کے اس وقت کے وقائع نگار خصوصی نے پریس کے لئے مرتّب کی تھی۔ وقائع نگار مذکور اجلاس میں از اوّل تا آخر موجود رہے اور انہوں نے اجلاس کی پوری تفصیلات، ذمہ دارانہ طریق سے قلم بند کیں۔ اس کارروائی کے اجزا، دیگر اردو اخبارات میں بھی شائع ہوئے تھے، مگر پورا متن روزنامہ "سعادت" لائل پور (۲۷۔جون ۱۹۶۸ء) نے شائع کیا تھا۔ یہاں مذکورہ روزنامے سے ہی یہ روئداد نقل کی جارہی ہے۔

مرتّب

- غفلتوں کے پردے چاک ہو گئے،
- پاکستان بنانے والے پاکستان بچانے والے،
- اہل سُنّت وجماعت کا نیا دور،
- گنگ زبانیں بولنے لگیں،
- کوئی نہ سر جھکا کے چلے،

آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس سے اجلاس "یومِ رضا" لاہور تک

لاہور میں ایک تاریخی مذہبی جلسہ کا آنکھوں دیکھا حال (وقائع نگار خصوصی)

۲ جون ۶۸ء یعنی ۵ ربیع الاوّل ۱۳۸۸ھ اتوار کا دن تھا لاہور میں صبح ہی سے فضا میں گھٹن تھی اور گرمی کا احساس لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ سرکلر روڈ (سٹیشن سے دربار جانے والی سڑک) ابھی تقریباً سنسان تھی۔ اکے دکے تانگے اور ٹیکسی رکشائیں سٹیشن کی طرف آجا رہی تھیں۔ ساڑھے سات بجے کا عمل ہو گا باغ بیرون موچی دروازہ کے بالمقابل برکت علی اسلامیہ ہال کی خوبصورت عمارت کے سامنے چند نوجوان (جنہوں نے اپنے سینوں پر سبز و سفید کپڑے کے مخصوص بیج لگا رکھے تھے) ماحول سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھے ہال کے اندر لاؤڈ سپیکر لگ رہا تھا۔ باہر ریڑھوں سے کرسیاں اتاری جا رہی تھیں۔ کولر میں پانی بھرا جا رہا تھا۔ ریڑھے سے اتری ہوئی کرسیاں ہال کے اوپر گیلری میں پہنچائی جا رہی تھیں۔ اِدھر سٹیج پر میز اور صدارتی کرسی کا انتظام بھی ہو رہا تھا یہ سارے کام نوجوان کر رہے تھے اپنے کاموں میں مشغول یہ نوجوان خوش و خرم ہشاش بشاش چہروں کے ساتھ آنے

والوں کا استقبال بھی کر رہے تھے۔ یہ سب لوگ کون تھے اور کیا کر رہے تھے۔؟
یہ مجلس صداقت اسلام کے کارکن تھے اور اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں "یوم
رضا" کے جلسے کا انتظام کر رہے تھے۔ آٹھ بجے جلسہ شروع ہونے والا تھا بالآخر آٹھ
بج گئے۔ مہمانوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ صدر جلسہ جناب جسٹس شمیم حسین قادری کا انتظار تھا
ادھر بجلی کا واپڈا ہو چکا تھا یعنی ہال کی بجلی بند تھی۔ دو کارکن واپڈا کے فرشتوں کو
تلاش کر چکے تھے جو کہ ساتھ ہی عقب والی سڑک پر بجلی کے تاروں سے الجھے ہوئے
تھے ان کی منت کی گئی کہ وہ کوشش کر کے ہال میں بجلی کی رو بحال کر دیں وقت آٹھ
سے اوپر جا رہا تھا۔ اب مزید انتظار مجلس صداقت اسلام کی روایات کے خلاف تھا
مجلس کے صدر قاضی عبدالنبی کوکب کی عارضی صدارت میں جلسہ کا آغاز کر دیا گیا اور
قاری عطا اللہ صاحب نے تلاوت کلام پاک کی تلاوت کے بعد سٹیج سیکرٹری کی آواز
بلند ہوئی "حضرات! چونکہ یہ جلسہ مجدد ملت اعلےٰ حضرت شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ
کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے اس لئے میں بشیر حسین ناظم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ سٹیج
پر تشریف لائیں اور کلام رضا پیش کریں" بشیر حسین ناظم صاحب نے اعلیٰ حضرت فاضل
بریلوی کی ایک نعت شروع کی اور آواز کا جادو جگانے لگے۔ حاضرین جھوم جھوم کر داد
دیتے رہے۔ یہ دل والوں کی محفل تھی اور یوں لگتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتوں
نے سارے جلسے کو اپنے احاطے میں لے رکھا ہے۔ نعت کے بعد مجلس کے
جنرل سیکرٹری جناب محمد حنیف غازی صاحب مائیک پر تشریف لائے اور انہوں
نے بتایا کہ ہم "یومِ رضا" اس لئے منا رہے ہیں کہ عوام اہل سنت کے سینوں میں
اعلےٰ حضرت فاضل بریلوی سے محبت اور عقیدت کی جو چنگاریاں زندہ ہیں ان
چنگاریوں کی مدد سے ایک ایسا شعلہ روشن کیا جائے جس سے وقت اور ماحول کی
تمام ظلمتیں اور تاریکیاں دور ہو جائیں اس دوران میں نعرہ صدر جناب جسٹس شمیم حسین قادری

تشریف لا چکے تھے اور صدارتی کرسی پر عارضی بیٹھنے والے صدر نے صمیم قلب کی خوشی سے صدارتی ذمہ داری ان کے سپرد کردی اور خود حاضرین کی صف میں جا بیٹھے۔ اے کاش ! دین پسند طبقے کا یہ اخلاص اہل سیاست کے لئے بھی مشعل راہ بن سکے۔ اب اسٹیج سیکرٹری نے مجلس کے صدر جناب مولانا قاضی عبدالنبی کوکبؔ کو دعوت دی کہ وہ اپنی افتتاحی تقریر ارشاد فرمائیں ۔ مولانا کوکبؔ اپنے مخصوص پُراعتماد لہجہ اور رواں دواں انداز کے ساتھ بول رہے تھے اور ہمارے مورخ نے اب تک جو نا انصافیاں اور غفلتیں برتی تھیں ان کا پردہ چاک کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرگرم مرکزی رول ادا کرنے کی پاداش میں علمائے اہل سنّت پر بے پناہ مظالم توڑے گئے اور انگریز کی شاطر نگاہ یہ بھانپ گئی کہ اس کے اقتدار کو جب کبھی چیلنج ہوگا تو اسی خاکستر کی چنگاریوں سے ہوگا۔ پس اس کے ظلم کی انتہا ہوگئی ۔ چنانچہ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی میدان میں مسلمان مجبور محض بنا دیا گیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں جب آزادی وطن کا نعرہ بلند ہونے لگا تو بساط سیاست پر ہندو قبضہ تھا اور وہ اپنی عیاری سے مسلمان لیڈروں سے ہندوستانی قومیت کا مشترکہ نعرہ منوا چکے تھے۔ مولانا کوکبؔ اس وقت کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ انگریز سے مل کر ہندو کی سازش پروان چڑھ رہی تھی اور ہندو کے ذہن میں یہ بات تھی کہ انگریز کے جانے کے بعد وہ مسلمان کو اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑے گا لیکن ان حالات میں اللہ نے اہل سنت کے اکابر کو یہ توفیق بخشی کہ انہوں نے اپنی سابقہ روایات کے مطابق فراست ایمانی سے قوم کو ہندو کی عیاری سے خبردار کر دیا اور دینی نقطہ نظر سے ہندو کے ساتھ موالات کو ناجائز قرار دیا گیا۔ دو قومی نظریہ کے اظہار کی یہ پہلی آواز تھی جو غلام ہندوستان میں ایک مرد حق نے بلند کی تھی۔ برسوں بعد مسلمانوں کے لیڈروں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ وہ دو قومی نظریہ کا نعرہ لیکر میدان میں اترے پھر اس موقعہ پر بھی فاضل بریلوی کے فیض سے مستفیض ہونیوالے

علماء کے گروہ نے اس دو قومی نظریہ کو قبولیت عام کا درجہ دلایا۔ ۱۹۴۶ء میں
بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں اس ملک کے لوگوں نے
نظریہ پاکستان کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔ مولانا کوکب نے دینی رہنماؤں سے اپیل
کی کہ وہ لادینیت اور سرمایہ داری کے مقابلے کے لیے ایک مضبوط دینی قیادت
پیدا کرنے کے لیے متحد ہو جائیں۔ اس کے بعد صوفی اللہ دتہ صاحب سے درخواست
کی گئی کہ وہ اعلیٰ حضرت کی نعت پیش کریں۔ صوفی صاحب کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز
جذب وکیف کی لہریں بکھیرنے لگی۔ حاضرین وجد میں جھوم رہے تھے اگرچہ ہال میں
ابھی تک بجلی نہ آئی تھی اور گرمی اور حبس کی وجہ سے دم گھٹا جا رہا تھا لیکن یہاں موسم
کی گرمی کا کس کو ہوش تھا اعلیٰ حضرت کی نعت نے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا اور
سوز عشق کے شعلے اللہ اکبر اللہ اکبر کی صورت میں بلند ہو رہے تھے شاید قدرت کو اپنے
بندوں کی یہ ادا پسند آگئی اور صوفی اللہ دتہ نے سینے کی پوری قوت سے جب
اس مصرع کی تان اٹھائی ع " بڑھ چلی تیری ضیاء اندھیر عالم سے گھٹا " تو یک لخت
ہال کا اندھیرا ابھی دور ہو گیا بجلی کی رو بحال ہوگئی اب ہال روشن تھا اور پنکھے اپنی پوری
رفتار سے ہال کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے اور صوفی اللہ دتہ صاحب وجد میں
شعر مکمل کر رہے تھے ؎

بڑھ چلی تیری ضیاء اندھیر عالم سے گھٹا
کھل گیا گیسو ترا رحمت کا بادل گھر گیا

اور ہال میں تکبیر و رسالت کے نعرے سلگتے رہے اور فیض رضا زندہ باد سے ہال
گونجتا رہا۔ اس کے بعد اہل سنت کے معروف فقیہ مولانا مفتی اعجاز ولی الرضوی تشریف لائے
آپ نے بعض ان امور کی طرف توجہ دلائی جو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت فاضل
بریلوی میں مشترک پائے جاتے تھے۔ مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ حضرت شاہ

احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے برعظیم میں فقہ حنفی کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے اور آپ کے فقہی تبحر کے آپ کے دشمن بھی قائل تھے دراصل مفتی صاحب کو اپنا وہ مقالہ پڑھنا تھا جو آپ نے مقالات "یوم رضا" کے لیے لکھا تھا (یہ کتاب اس یادگار موقعہ پر شائع کی گئی تھی)، لیکن آپ کے سینہ میں جذبات کا جو سمندر موجزن تھا وہ رسوم و قیود کی حدبندیاں توڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مقالہ پڑھنے کے لیے کتاب مفتی صاحب کے ہاتھ میں پکڑی رہ گئی اور آپ دل کی زبان سے حاضرین سے خطاب کرتے رہے تا آنکہ آپ کی تقریر کا وقت ختم ہو گیا اور پھر آپ نے چند منٹوں میں اپنے مقالے کا ملخص پیش کیا اور سٹیج سے سامعین کی صف میں آ گئے۔ یوم رضا کی اس مرکزی مجلس میں شرکت کے لیے اوکاڑہ سے مولانا غلام علی اشرفی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی تقریر[1] سے حاضرین کو نوازا۔ بھیرہ ضلع سرگودھا سے حضرت پیر کرم شاہ صاحب اس اہم اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ آپ نے نہایت فاضلانہ اور تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پس منظر اور بعد کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح انگریز نے علمائے حق سے انتقام لیا اور ایک ایسا گروہ پیدا کیا جو دین کی تاویلیں انگریز کی مرضی کے مطابق کرنے لگا۔ ایسے کٹھن حالات میں علمائے حق کا ایک گروہ دین کی حرمت کو بچانے کے لیے میدان میں موجود تھا اور انھیں لوگوں میں مولانا شاہ احمد رضا بریلوی جیسی ممتاز شخصیت بھی موجود تھی۔ آپ نے بھی اس حقیقت کا اعادہ کیا

---

[1] حضرت ابو البیان مولانا غلام علی اشرفی نے اپنی تقریر میں "سنت" اور "بدعت" کے شرعی مفاہیم کو اپنے خاص انداز میں فرمایا اور ثابت کیا کہ امام اہل سنت مولانا احمد رضا قدس سرہٗ نے سنت کے احیاء اور مسلک اہل سنت کے فروغ کے لیے اپنی زندگی وقف رکھی۔ فاضل مولانا نے اس الزام کی تردید کی کہ امام اہلسنت اور ان کے تلامذہ بدعات کی حوصلہ افزائی کرنے والے ہیں۔ افسوس ہے، مولانا کی پوری تقریر محفوظ نہ ہو سکی۔ (مرتب)

کہ تحریک پاکستان کی حمایت کرنے والے علماء مولانا شاہ احمد رضاؒ کے مسلک سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اب پونے گیارہ بج چکے تھے ادھر گرمی اپنے شباب پر تھی۔ (اس روز درجہ حرارت ۱۰۹ درجے کے قریب پہنچ گیا تھا) ادھر جلسہ اپنے عروج پر تھا حاضرین کی تعداد اتنی تھی کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ گیلری پر اتنے لوگ تھے کہ شاید وہ مزید بوجھ سہارنے سے انکار کر دیتی۔ صدر جلسہ کی تجویز پر سٹیج کے عقب میں بھی کرسیوں کی ایک رو لگا کر وہاں بھی کچھ لوگ بٹھا دیے گئے تھے۔ ہال سے باہر سائبان کے نیچے بھی کوئی جگہ نہ تھی اور لوگ عملاً دھوپ میں کھڑے تھے لیکن جذبہ و شوق کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی جلسہ چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھا۔ سامعین کی صف میں اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین علامہ علاؤ الدین صدیقی جیسی شخصیت بھی موجود تھی انھیں اگرچہ منتظمین نے بحیثیت مقرر دعوت نہیں دی تھی لیکن وہ اپنے جذبے اور شوق کے تحت چلے آئے تھے۔ آخر ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا گیا اور انھیں بھی اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی گئی۔ علامہ صاحب نے بتایا کہ جس طرح ادیانِ عالم میں دینِ اسلام ہے اسی طرح اسلام کے جملہ فرقوں میں اہل سنّت کو خاص حیثیت حاصل ہے آپ نے مولانا شاہ احمد بریلویؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ جب دین کی قدروں کو نیچے گرایا جا رہا تھا اس وقت مولانا شاہ احمد رضا قادریؒ آگے بڑھے اور انھوں نے دین کی قدروں کو ان کے صحیح مقام پر ثبات بخشا۔ انھوں نے کہا کہ اعلیحضرت فاضل بریلویؒ امام اہل سنت تھے اس لیے مسلمانوں کو فاضل بریلویؒ کی زندگی کو مشعل راہ بنانا چاہیے۔ علامہ صاحب نے مسلمانوں کے اندر اتحاد کی اہمیت پر زور دیا۔ اب تحریک ختم نبوت کے مجاہد مولانا عبدالستار خاں نیازی تشریف لائے اور انھوں نے ماضی کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ بعض سیاسی لیڈر علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا۔ آپ نے

اس الزام کو بہتان قرار دیا اور کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ سے بہت پہلے مولانا شاہ احمد رضاؒ نے مسلمانوں کے سینوں میں یہ بات نقش کر دی تھی کہ مسلمانوں کی سیاست ان کے دین سے جدا نہیں ہو سکتی اور ہندو کے ساتھ موالات قطعاً حرام ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان لیڈر جب کانگرس سے جدا ہو کر دو قومی نظریہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو مسلمان فوراً اپنے مذہبی رہنماؤں کے خیالات کی روشنی میں اس پروگرام پر لبیک کہتے ہیں۔ اس کے بعد صدر جلسہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج جناب شمیم حسین قادری نے اپنے صدارتی خطاب میں حضرت فاضل بریلوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ عاشق رسولؐ تھے اور یہی عشق رسولؐ کا مسلک عام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرورِ کائنات کی محبت نہ صرف اس دنیا میں ہماری مشکلات کا حل ہے بلکہ اگلی دنیا میں بھی نجات کا باعث ہے۔

جسٹس شمیم حسین قادری نے فرمایا کہ قوم پر جب کبھی سیاسی اور تہذیبی مشکل کا وقت آیا تو علمائے کرام ہی آگے بڑھے اور انھوں نے قوم کے لیے قربانیاں دیں۔ اب جلسہ ختم ہو رہا تھا مجلس صداقت اسلام کے صدر مولانا قاضی عبدالنبی کوکب مائیک پر تشریف لائے اور انھوں نے مقررین، سامعین اور صدر جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ آج کے اس اجتماع نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ تحریک پاکستان کو قوت بخشنے والے علمائے اہلسنت ہی تھے۔ آپ نے کہا کہ اس کے بنانے والے اور اس کو بچانے والے ہم لوگ ہی ہیں۔ اس جلسہ میں گوجرانوالہ، گجرات، اوکاڑہ اور بھیرہ ضلع سرگودھا کے احباب نے شمولیت فرمائی تھی۔ لاہور کے تمام دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلباء اور ملازمین کی کثیر تعداد بھی جلسہ میں آخر تک موجود تھی۔ جلسہ کے اختتام پر اعلیٰحضرت کا سلام پڑھا گیا اور ان کی روح کو ایصالِ ثواب کیا گیا۔ جلسہ گاہ سے نکلتے ہوئے دینی حلقوں کا

تاثر یہ تھا کہ غلام ہندوستان میں آل انڈیا سُنی کانفرنس بنارس کے بعد اس جلسہ "یوم رضا" نے اہل سنت وجماعت کو نئے حوصلے اور نئے ولولے عطا کیے ہیں اور جماعتی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے ہم مسلک طلبار کا سر فخر سے بلند تھا اور وہ کہہ رہے تھے کہ آئندہ کوئی سر جھکا کے نہ چلے۔ کیوں کہ ہمارے اسلاف نے باعث فخر کردار چھوڑا ہے اور آج حقیقت حال سامنے آجانے کے بعد ہماری زبانیں گنگ نہیں رہیں گی بلکہ ہم دعوے سے اپنے اسلاف کی خدمات کا تذکرہ کرسکیں گے اور یہ سب طبقے اپنے نوجوان قائد مولانا قاضی عبدالنبی کوکب کے ممنون تھے کہ جن کی بصیرت نے اس قومی اور ملی خدمت کو سرانجام دیا۔

مقالات

- پیرزادہ کرم شاہ ازہری
- مولانا عبدالستار خاں نیازی
- مولوی ابراہیم علی چشتی

پیرزادہ سیّد محمد کرم شاہ ازہری (بھیرہ)

مقالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَ
اَصْحَابِہٖ وَاَوْلِیَاءِ اُمَّتِہٖ وَعُلَمَاءِ مِلَّتِہٖ اَجْمَعِیْنَ ——— امّا بعد!

صدر محترم! اور معزّز حاضرین!

جس عالم ربّانی اور فاضل المعی کی یاد منانے کیلئے یہ جلسہ منعقد ہو رہا ہے اس کی تاریخ ولادت ۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء اور تاریخ وصال ۲۵ر صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء ہے۔

جو شخص برصغیر پاک و ہند کی ماضی قریب کی تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے اسے خوب معلوم ہے کہ یہ عرصہ کتنا پُر آشوب اور ہنگامہ ہائے رستاخیز سے معمور تھا انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اس کے عصری حالات جو فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگ اپنے عصر کے تقاضوں سے منفعل اور متاثر ہوتے ہیں اور بعض لوگ خود ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسلئے کسی کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے زمانہ کے احوال سے صرفِ نظر قطعاً مستحسن نہیں۔ اس لئے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلسنّت مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات کو سمجھنے کے لئے آپ کے عہد کے مزاج کو سمجھنا اور ان تاریخی عوامل کا جائزہ لینا ازحد اہم ہے جو اس وقت کار فرما تھے۔

افقِ ہند پر ایک ہزار سال تک درخشاں رہنے کے بعد اب مسلمانوں کا آفتابِ اقبال غروب ہوا چاہتا ہے۔

بابر اور اورنگ زیب کی اولاد اب شمشیر و سناں سے راہ و رسم توڑ چکی ہے اور طاؤس و رباب پر فریفتہ ہونے لگی ہے۔ جہاں جوانوں کا خون گرمانے کے لئے رجز پڑھے جاتے تھے وہاں اب عصمت فروش رقاصائیں اپنی پائیلوں کی جھنکار سے غیرت و حمیّت کے جذبات کو لوریاں دے رہی ہیں۔ جہاں مائیں بچوں کو خالد و طارق کے قصّے سنا کر پروان چڑھاتی تھیں، وہاں اب عشق و حسن کی بدمستیوں کی کہانیاں وجہ تسکین خاطر اور باعث گرمی محفل بن گئی ہیں روحوں کی پاکیزگی حوصلوں کی بلندی اور عزائم کی پختگی کو عیش و عشرت کی دیمک نے چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے جن کے آباؤ اجداد کے نام سن کر اغیار کے دل لرز لرز جایا کرتے تھے ـــــ آج لال قلعہ کی مضبوط سنگین دیواریں اور گہری خندقیں بھی دشمنوں کی یلغار سے انہیں پناہ نہیں دے سکتیں۔ ملک کے طول و عرض میں ہر طرف فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے۔ ایک مملکت سینکڑوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی ہے۔ کہیں مرہٹوں کی بربریت نے کہرام مچا رکھا ہے اور کہیں سکھوں کے وحشیانہ مظالم سے قیامت برپا ہے۔ مغل اقتدار راس کماری اور درۂ خیبر سے سمٹ کر قلعہ معلّٰی میں محصور ہو گیا ہے۔

انگریز اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر اپنی گرفت دن بدن مضبوط کرتے جا رہے ہیں یکے بعد دیگرے ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ان کے زیر نگیں ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان المناک حالات میں اسلامی حمیّت نے پھر جھرجھری لی۔ حضرت مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے نعرۂ جہاد سے سارا ہندوستان گونج اٹھا فرنگی استعمار کا مقابلہ کرنے کے لئے علماءِ حق کفن بدوش، سر بکف میدانِ عمل میں اتر آئے

ہندوستان کا ہر قابل ذکر شہر میدان کارزار بن گیا اور شمع آزادی کو روشن رکھنے کیلئے مسلمانوں نے بے دریغ قربانیاں دیں لیکن جاہ طلب اور مصلحت اندیش امراء کی غداری اور صحیح فوجی قیادت کے فقدان کے باعث ملک و ملت کے سرفروش مجاہدین کی یہ کوشش برآور نہ ہو سکی۔ فاتح انگریز کی آتش انتقام بھڑک اٹھی اور جنگ آزادی کے سپاہیوں کو چُن چُن کر تہ تیغ کیا جانے لگا۔

چونکہ آزادی کی صور اسرافیل پھونکنے والے، جہاد کے نقارہ پر پہلی چوٹ لگانے والے میدانِ جنگ میں کفر و باطل کو للکارنے والے اکثر و بیشتر علماء اہل سنت اور ان کے پیروکار تھے اس لئے انتقام کے شعلے انہیں کی طرف لپکے۔ انگریز کی آتشِ غضب انہی کے خرمنِ امن و عافیت کو خاکستر بناتی رہی۔ حریت کیش مجاہدین کو سزا دینے کے لیے جگہ جگہ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ چند سفاک اور خون آشام لوگوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ مردانِ حُر کو جنہوں نے خوشی سے غلامی کی بیڑیاں پہننے سے انکار کر دیا تھا جو چاہیں سزا دیں۔ ان کا سفاک قلم عدل و انصاف کے سارے تقاضوں کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ جلیل القدر فضلا کو جن کی نظیر مادرِ گیتی بار بار پیدا نہیں کرتی۔ عبور دریائے شور کی سزا دی جاتی ہے۔ سینکڑوں کو جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔ ہزاروں علماء کو درختوں کے تنوں سے باندھ کر گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔

فطرت بڑی کفایت شعار ہے دیدۂ بینا اور عقل رسا کی نعمت ارزاں اور عام نہیں ہوتی۔ برسوں کی تگ و دو کے بعد کہیں کوئی مرد حکیم بزم آرا ہوتا ہے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ایک عالم ربانی کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کو بھرنا مشکل ہوتا ہے یہاں تو سینکڑوں نابغہ روزگار ہستیاں بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دی گئی تھیں

ان کی شہادت اور جلا وطنی سے ایک ناقابل تلافی اور ہولناک خلا کا پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔ قوم اپنے ذہنی ارتقا، علمی نشوونما، تہذیبی اقدار کی حفاظت اور اپنے عقائد کے تحفظ کے لئے علماء کی محتاج ہوتی ہے۔ جب تک قوم میں ایسے مردان حُر موجود ہوتے ہیں جن کی نگاہیں حقیقت شناس اور زبانیں حق گوئی میں بیباک ہوتی ہیں تو کوئی فتنہ قوم کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اُدھر کوئی فتنہ کھڑا ہوا اِدھر ان کی تلوار بے نیام ہوئی اور بجلی بن کر گری اور اس فتنہ کو خاک کا ڈھیر بنا دیا لیکن جب ایسے نفوس سے قوم کی بزم خالی ہوجاتی ہے تو ہر بہروپئے کو کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ اپنی شاطرانہ چابکدستی سے لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا لیتا ہے۔ جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد ملت اسلامیہ کو اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طوفان نے ان دمکتے ہوئے اَن گنت چراغوں کو گل کردیا جن سے رشد و ہدایت کی روشنی پھوٹ رہی تھی ہر طرف مایوسی اور اداسی کے اندھیرے چھاگئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھرے ہوتے جارہے تھے۔

اہل نظر کو ایک بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ انگریز کا ہندوستان پر تسلط فوجی قوت کی بالادستی میں محدود نہ تھا بلکہ ان کے ہمرکاب ان کی مادی ترقی کی مبالغہ آمیز داستانیں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ سائنس کے جدید اور تعجب خیز انکشافات بھی تھے۔ ان کے پاس صنعتی اور فنی محیر العقول ایجادات بھی تھیں۔ مزید برآں وہ ایک ملحدانہ فلسفہ حیات بھی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ ان میں سے ہر ایک چیز مفتوح اور مغلوب قوم کے متاع ہوش و خرد کو لوٹ لینے کے لئے کافی تھیں۔ دشمن بڑے مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر یہاں آیا تھا اور یہاں اس کی دعوت مبارزت کو قبول کرنے والے اور اس کی نخوت و رعونت کو خاک میں ملانے کا دم خم رکھنے والے یا اپنی پُر انوار مرقدوں میں آرام فرما تھے یا اسیران زندانِ جفا۔ میدان خالی تھا۔ انگریز نے اسلامی حکومت کا چراغ گل کرنے کے بعد انہیں دولت دین و ایمان سے محروم کرنے کا بھی عزم بالجزم کرلیا کیونکہ ملت صالح اور حکیمانہ قیادت سے محروم ہوچکی تھی

اس لئے بعض نوجوانوں کو جن میں حکمت کی متانت کم اور جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے، انگریز نے اپنے دامِ فریب میں آسانی سے اسیر کر لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک ایسی کھیپ تیار ہو گئی جن کے قلب و نظر کو اغیار کی عشوہ طرازیوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ وہ برملا اسلامی تعلیمات کا استخفاف کرنے لگے دین کے اصول، دین کے مسلّمات کا انکار ان کے لئے قطعاً کوئی اہم بات نہ رہی انہیں اپنے اسلامی تمدن سے بھی گھِن آنے لگی وہ اپنی تابانِ ماضی سے بھی نفرت کرنے لگے اور اپنے اسلاف کرام سے قطع تعلق کرنے میں ہی اپنی عزت و توقیر سمجھنے لگے اور خود خوشامد پسند اور کاسہ لیسوں کے سرخیل ہوتے ہوئے اُن پیکرانِ استغناء و استقامت پر تملق پیشگی شاہ پرستی کی تہمت لگانے لگے جن کی سیر چشمی اور بے نیازی کی قسم فرشتے کھا سکتے تھے۔

غرضیکہ ہر وہ چیز جو اسلام کے تقدس اور روحانی عظمت کی آئینہ دار تھی اس کو بے توقیر اور بے وقعت کر دینے کی کوشش کو خدمتِ اسلام کا نام دیا جانے لگا۔ عظمتِ اسلام کو ہدفِ طعن بنانے کی خدمت وہ نوجوان انجام دینے لگے جو ملّت کی امیدوں کا مرکز اور خوابوں کی تعبیر بننے کی اہلیت رکھتے تھے شجرِ اسلام کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے وہ لوگ پیش پیش تھے جن کے آباؤ اجداد نے اپنے خونِ ناب سے اسے سینچا تھا۔

ع غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

نورِ دیدہ پیرِ کنعان چشمِ زلیخا کو کیوں روشن کرنے لگا؟ اپنوں سے کٹ کر بیگانوں سے محبت کی پینگیں کیوں بڑھائی شروع کر دیں؟ ضروریاتِ دین اور مسلّماتِ دین پر اس کا یقین کیوں متزلزل ہو گیا۔ آیاتِ قرآنی کی بے جا تاویلات بلکہ تحریفات کی جرأت اس میں کیوں پیدا ہو گئی؟ یہ سوالات اتنے غیر اہم نہیں ہیں کہ ان سے پہلو تہی کر کے انسان آگے گزر جائے بلکہ یہ ہر مخلص مسلمان کیلئے دعوتِ فکر ہے جن پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ہمارا فرضِ اولیں ہے میرے

نزدیک اس کے کئی اسباب تھے۔ سیاسی ادبار کے بعد احساس کہتری جدید فاتح قوم کی مادی قوت علمی سربلندی اور دل و نظر کو مسحور کر دینے والے افکار و نظریات اور ایسے علماء کا فقدان جو ان عوامل و محرکات کی طغیانیوں کے سامنے سدِ سکندری بن کر کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ان کے علاوہ ایک ایسی تحریک جس نے مسلمانوں کے دل سے حضور نبی مکرّم و معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت کے نقوش دھندلا دینے کے بعد محبتِ حبیبِ کبریا علیہ اطیب التحیۃ والثناء کے چشمۂ فیاض کو گدلا کرنے کی مساعی کو دینِ حق کی صحیح خدمت خیال کر لیا جب آنکھیں خاکِ مدینہ و نجف سے سرمگیں نہ ہوں تو دانشِ فرنگ کے جلوے اسے بآسانی خیرہ کر لیتے ہیں جب دل محبوب رب العالمین کے صہبائے عشق سے سرشار نہ ہو تو نفس کی ہوس ناکیاں اسے بآسانی بدمست کر سکتی ہیں۔ جب ذہن کی لوح پر عظمتِ مصطفےٰ کا نقش جلی قلم سے مرقوم نہ ہو تو اس لوح پر آپ کوئی سا نقش بھی کندہ کر سکتے ہیں۔ جب سرورِ عالم و عالمیان سے بندہ مومن کا رشتۂ عقیدت ٹوٹ جائے تو اس کو ہر صیاد اپنا نخچیرِ زبوں بنا سکتا ہے۔

سیاسی ادبار کے ساتھ ذہنی اور فکری اتحاد بھی پارہ پارہ ہونے لگا۔ وہ اساس محکم کمزور ہونے لگی جس کے سہارے قصرِ اسلام حوادثاتِ دہر کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایسی چیزیں بھی ظہور پذیر ہونے لگیں جن کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان ہی میں سے ایک شخص نے نبوّت کا دعویٰ کر دیا۔

دین کے ایک ایک مقصد سے برملا غداری کی۔ جہاد کو حرام کر دیا۔ اتنی جسارت کے باوجود اسی ملّت میں سے اسے اپنے حواری تلاش کرنے میں بھی کوئی دقّت نہ ہوئی۔ جو سانحہ اسلام کی تیرہ صد سالہ تاریخ میں رونما نہیں ہوا تھا، وہ انگریزی اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتے ہی وقوع پذیر ہو گیا۔

ان حالات میں بریلی کے ایک معزز خاندان میں ایک روحِ ارجمند تشریف فرما ہوئی جس کے مقدر میں ان تمام داخلی اور مذہبی فتنوں سے نبرد آزما ہونا رقم تھا، وہ پیکرِ

حسن و جمال، مصدرِ جود و نوال، منبع فضل و کمال اور مرکزِ عشق و محبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملّت کا رشتہ عقیدت و نیازمندی استوار کرنا تھا۔ رحمت الٰہی نے بڑی فیاضی سے انہیں بے نظیر صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ بلا کا حافظہ، ذہن وقاد، طبع رسا، اقلیم فصاحت و بلاغت کی سروری قدرت کے بروہ عطیے تھے جن میں سبقت تو کجا کوئی ہمسری کا دعوٰی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی متداول اور غیر متداول علم و فن ایسا نہ تھا جس میں آپ کی قابلیت کا لوہا نہ مانا جاتا ہو۔ علومِ دینیہ، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں آپ کو جو عدیم النظیر مہارت حاصل تھی اس میں تو کسی کو کلام نہیں لیکن ریاضی تکسیر نجوم وغیرہا علوم جن کے مبادیات سے بھی اکثر فضلاء بے خبر ہوتے ہیں۔ ان علوم میں بھی آپ کے تبحّر اور مہارت کا یہ عالم تھا کہ چوٹی کے ریاضی دان مشکل سے مشکل مسائل حل کرنے کے لئے آپ کی بارگاہ کا رخ کیا کرتے تھے اور جن مسائل کو وہ لاینحل قرار دے چکے ہوتے آپ اشاروں میں حل کر کے انہیں محوِ حیرت کر دیتے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے زمانہ میں ریاضی کے مسلّم ماہر تھے۔ حضرت مولانا شاہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ پروفیسر دینیات مسلم یونیورسٹی نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ریاضی کے چند مسائل میں متفکر ہیں اور وہ حضرت سے مل کر ان کا حل دریافت چاہتے ہیں۔ اجازت ہو تو شرف باریابی حاصل کریں۔ اعلیٰ حضرت نے بصد مسرت اجازت مرحمت فرمائی چنانچہ ڈاکٹر صاحب چند روز بعد بریلی تشریف لے گئے۔ نماز عصر کا وقت تھا۔ نماز ادا ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت اپنی مسند پر تشریف فرما ہوئے اور سلسلہ گفتگو شروع ہوا دورانِ گفتگو اعلیٰ حضرت نے اپنا ایک قلمی رسالہ جس میں مثلث اور دائرے کے اشکال بنے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کیا جس کو دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب حیرت و استعجاب میں ہو گئے اور بولے کہ میں نے اس علم کو حاصل کرنے کے لئے بارہا غیر ممالک

سینہ سپر رہا۔ کسی موقع پر نہ اس میں لچک پیدا ہوئی اور نہ پائے استقامت ڈگمگایا۔ آپ کی ساری زندگی حضرت حسانؓ کے اس شعر کی آئینہ دار رہی۔

فان ابی ووالدہ وعرضی لعرض محمد منکم وقاء (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ درست ہے کہ آپ کا اصل میدان عمل دین اور علوم دینا کی خدمت کرنا تھا۔ اور آپ کا طبعی رجحان سیاست کی طرف نہ تھا لیکن آپ کی ایمانی بصیرت اور مومنانہ فراست نے نہ آپ کو بعض لوگوں کی طرح انگریز کا حلقہ بگوش بننے دیا اور نہ کبھی ہندو کا دام زر دار انہیں اپنی گرفت میں لے سکا۔ آپ کے قلب مومن نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اسلامی غیرت اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکتی کہ مومن گداگروں کی طرح غیر مسلم حکومت سے مراعات اور عطیات کی دریوزہ گری کرے اور نہ اسے یہ گوارا ہے کہ لالہ جی کے مکر و فریب میں اسیر ہو کر ملت اسلامیہ کا مقدر اس بنیا کے ہاتھ میں دیدیں جو شرف انسانیت سے بالکل بے بہرہ ہے لیکن جب قائداعظم علیہ الرحمۃ کی قیادت میں ملت مسلمہ نے پاکستان کو اپنی منزل مقصود قرار دیا تو یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آپ کے مکتب فکر سے وابستہ جتنے علما و مشائخ، اساتذہ و طلباء مدارس و خانقاہیں تھیں، سب نے بلا استثناء اپنی کوششیں پاکستان کے حصول کیلئے وقف کر دیں۔ اور اس کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا جس وقت پاکستان کا نام لینا ہزاروں مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا جب کہ میدان سیاست کے بڑے بڑے تجربہ کار سپاہی پاکستان کے تصور سے کانپ اٹھتے تھے جب کہ بڑے بڑے رؤسا اور نواب پاکستان کی حمایت میں ایک لفظ کہنا خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے جب کہ بڑے بڑے مدارس کے فضلاء قیام پاکستان کو اسلام کے مزاج کے خلاف یقین کرتے تھے۔ اس وقت ایک اعلیٰ حضرت بریلوی کا مکتب فکر تھا جس کے وابستگان نے چٹاگانگ سے پشاور تک اور سلہٹ سے کراچی

کے سفر کئے مگر یہ باتیں کہیں بھی حاصل نہ ہوئیں۔ میں تو اپنے آپ کو اس وقت طفل مکتب سمجھ رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر یہ فرمائیں کہ اس فن میں آپ کا استاد کون ہے۔ اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی استاد نہیں ہے۔ میں نے اپنے والد ماجد علیہ الرحمۃ سے جمع تفریق، ضرب تقسیم کے محض چار قاعدے صرف اس لئے سیکھ لئے تھے کہ ترکہ کے مسائل میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ شرح چغمینی شروع کی تھی کہ حضرت والد ماجد نے فرمایا کہ اس میں اپنا وقت کیوں صرف کرتے ہو۔ مصطفےٰ پیارے کی بارگاہ سے یہ علوم تم کو خود ہی سکھا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں مکان کی چار دیواری کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ سب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کرم ہے۔ اس کے بعد کشور اعشاریہ، متوالیہ کا ذکر چل پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا بس صرف تیسری قوت تک کا سوال حل کیا جا سکتا ہے۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے سید قناعت علی اور سید ایوب علی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں نے ان دونوں بچوں کو کچھ قاعدے سکھا دیئے ہیں آپ انہیں جس قوت کا سوال دے دیں انشاء اللہ تعالےٰ یہ بچے حل کر دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب محو حیرت ہو کر دونوں بچوں کا منہ تکنے لگے۔ یہ بے مثل فہم و ذکا، یہ بے نظیر علم و فضل اور یہ گوناگوں صلاحیتیں قدرت نے کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لئے ارزاں فرمائی تھیں۔ چنانچہ آپ نے پونے چودہ سال کی عمر میں تمام علوم کی تکمیل فرمائی اور اس کے بعد تدریس و تالیف و تصنیف، وعظ و ارشاد، ریاضات و مجاہدات، ان فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہوئے اور آخری دم تک بڑی جرأت، ہمت اور بے باکی کے ساتھ اسلام کے دفاع میں مصروف رہے۔ کوئی فتنہ ہو اس نے کہیں سر اٹھایا ہو، احمد رضا کا قلم اس پر صاعقہ بن کر گرتا اور اسے خاک سیاہ بنا کر رکھ دیتا — مخالفت کی آندھیاں اٹھیں، بہتان تراشیوں کے طوفان اُمڈے لیکن اسلام کا یہ نڈر اور بے باک سپاہی حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشق صادق بلا خوف لومۃ لائم

تک پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا۔ کیا کوئی اس بات کا انکار کر سکتا ہے کہ یہ آپ کی ایمانی بصیرت کا فیضان نہ تھا۔ یقیناً یہ آپ کے فیض نظر کی برکت تھی۔ یقیناً یہ آپ کے نورِ نظر کا اجالا تھا جس نے شک و شبہ اور تذبذب اور تردّد کے سارے پردے چاک کر دئے۔

آپ کی زندگی کے یہ چند سال جن کا گوشہ گوشہ علم و عمل کے نور سے منوّر رہے، جن کا لمحہ لمحہ ذکرِ خدا اور یادِ مصطفےٰ علیہ اجمل التحیۃ والثنا سے معمور رہے جو دو ہزار تالیفات کی تصنیف سے مشرف ہے جو پند و موعظت اور ذکر و ارشاد کی محفلوں سے گونج رہا ہے جو پھیلا تو کائنات کی پہنائیوں کو شرمسار کرتا گیا اور جو سمٹا تو عشقِ مصطفےٰ بن کر رہ گیا یہی آپ کا ایمان تھا کہ حبِّ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم جانِ ایمان اور روحِ دین ہے۔ اسی کے پرچار میں آپ نے اپنی ساری عمر صرف کر دی۔ اسی کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں اور قابلیتیں وقف کر دیں۔

ولانا عبدالستّار خاں نیازی

مقالہ

صاحب صدر! آج ہم سب اعلیٰحضرت امام اہل سنّت وجماعت احمد رضا خاں علیہ الرحمۃ کے ۴۸ عرس یا جدید اصطلاح میں یوم منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔

تمام اسلامی اصطلاحوں کی مانند "عرس" کی اصطلاح بھی خود واضح ہے کہ ہم مسلمان غیر مسلم اقوام کی طرح اپنے اکابرین کے ایام ولادت نہیں مناتے۔ ماسوا حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم میلاد کے، جو ہمارے عقیدے کے مطابق تخلیق کائنات ہی کے وقت سے ماموریت کا منصب، تقدیر الٰہی سے پا چکے تھے اور باعثِ تخلیقِ ہر دو عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خدا سے عطا کردہ لقب رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (یعنی سب جہانوں کے لئے رحمت) مسلّم ہے لیکن تمام اولیاء اللہ اور علماء کرام کی تاریخ وصال یا تصوف کی اصطلاح میں "عرس" کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ غیر مامور من اللہ تکوینی جہت سے کسی بھی منصب کیلئے پیدا ہوں۔ طفولیت میں بہرصورت اس کمال منصب تک رسائی نہیں ہوتی جو خالق حقیقی کے پاس جاتے ہوئے معیار شرعی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

اس معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں اپنی تقریر میں اعلیٰحضرت کی ان فضیلتوں کا ذکر دوسرے مقررین پر چھوڑ دوں گا جو متعلقہ منصب کو بیان کرنے کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اعلیٰحضرت کے ہزارہا مریدان طریقت آج بھی برصغیر ہند و پاک میں موجود ہیں۔ وہ طریقت

کی دنیا میں ان کے فضائل مجھ سے بہتر بیان کر سکتے ہیں۔ تمام برصغیر کے ہر علاقہ میں ملّت اسلامیہ کے سوادِ اعظم یعنی نعمانی مسلک فقہ رکھنے والے علماء کرام، مدرسین، خطباء، واعظین وغیرہ یا براہِ راست اعلیٰ حضرت کے شاگرد ہیں یا ان کے شاگردوں اور عقیدت کیشوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ بہرحال راسخ العقیدہ اسلامی روایات کی پیروی میں سلف صالحین سے اخذ کردہ روایات کی مانند ان کے تعاون کو بھی حجّت شرعی تسلیم کرنے کے باعث اعلیٰ حضرت کے ہم مسلک فقہ تو ضرور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کو امام اہلسنت وجماعت متاخرین مانا جاتا ہے۔ چنانچہ جن اعتزالی اور انحرافی فقہی تحریکوں نے انگریزی کے دور غلامی میں خدا سے رسول کو جدا کرنے، قرآن کو حدیث سے پرے رکھنے۔ فقہ کو کتاب و سنّت کا مدِّ مقابل بنانے یا خدا اور رسولؐ کے مابین علم غیب کی تقسیم اپنے ناقص فہم قرآن کے ماتحت کرنے کی کوششیں کی ہیں اور جب عہد حاضر کے مسلمان کو اس کے صحیح تبلیغی منصب سے غافل کر کے طول طویل اور دور دراز کار ذہنی الجھنوں میں مبتلا کرنے کے شاخسانے کھڑے کر دیئے ہیں۔ تو ان کی تردید میں صحیح عقلی و نقلی دلائل کی تلاش بہرحال کسی نہ کسی مرحلے پر اعلیٰ حضرت کی تصانیف کی مدد سے کی جاتی ہے۔

امام اہل سنّت کی حیثیت میں بھی اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ کی بارہ جلدوں اور بقیّہ ایک ہزار بڑی چھوٹی تصانیف کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں سے سرسری تعارف کرانا بھی اعلیٰ حضرت کے فیض یافتہ علماء کرام کا ہی حصہ ہے۔ میں تو آج کی تقریر میں اپنا موضوع یہاں تک محدود رکھوں گا کہ ۱۸۵۷ء میں جب علماء سواد اعظم برصغیر کے سرخیل مولانا فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمۃ کے مرتب کردہ فتوائے جہاد سے پیدا ہونے والی تحریک کا عسکری سیاسی اقتصادی تعلیمی اور معاشرتی محاذ پر استیصال، انگریز، سر سالار جنگ اوّل مدار المہام نظام حیدرآباد دکن، سرسیّد اور ارسطو جاہ رجب علی جیسے ملّت فروشوں کی مدد سے کر چکے تو مسلمانوں کی خانقاہوں کے اوقاف، انگریزی فوجوں کے تسلط میں آ کر اس حالت کو پہنچ گئے کہ شاہی مسجد لاہور میں

گولہ بارود رکھا جاتا تھا، نیلہ گنبد انارکلی کے مزار کو گورا فوج کا مطبخ بنایا گیا اور مقبرہ انارکلی میں ملکہ وکٹوریہ کی پاپائیت کے ماتحت برٹش چرچ کا گرجا قائم کردیا گیا اور کم و بیش یہی حالت تمام ہندوستان کے اسلامی مقامات مقدسہ کی تھی۔ عربی فارسی کی جگہ اردو اور انگریزی زبانیں جبراً مروج کی گئیں تو اس وقت قضائے ربی نے "لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ" کے مصداق جون ۱۸۵۶ء ہی میں بریلی شریف کے ایک قدیم ریاست دنیاوی اور فضیلت علمی و روحانی رکھنے والے گھرانے میں اعلیٰ حضرت کو پیدا کیا۔ آپ کے ایام طالب علمی اور جوانی وہی زمانہ ہے جب کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ربع صدی تک تمام مسلمانانِ ہند پر قبرستان کی خاموشی اور اجاڑ کی کیفیت طاری تھی۔ کتابیں چھپتی تھیں تو صرف ان عالموں اور صوفیوں کی جو تاجداران لندن گئے آنجہانی ہونے پر شاہی مسجد دہلی اور شاہی مسجد لاہور میں ان کے لئے دعائے مغفرت پڑھا کرتے تھے (دراصل اسی مقصد کی خاطر یہ مساجد واگزار کرائی گئی تھیں) مدرسے بھی وہی قائم رہ سکے جو (اپنی سالانہ روئدادوں کی اصلی شہادت کے مطابق) ڈپٹی کمشنروں اور سرکاری افسروں کے زیر صدارت معاذ اللہ اسلام کی سب سے بڑی بنیادی تعلیم یہ قرار دیتے تھے کہ حاکم وقت کافر بھی ہو تو اس کی مخلصانہ وفاداری اور اطاعت مسلمان کا شرعی فریضہ ہے۔ دلیل یہ تھی کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق حبشی سردار کی اطاعت بھی فرض شرعی ہے (ان قود علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللّٰہِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهٖ فَاتَّبِعُوْهُ انگریز تو کالے کلوٹے حبشی نہیں ماشاء اللہ گورے چٹے خوبصورت حکمران ہیں۔ یہ بات تاویل سے گول کردی جاتی تھی کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حبشی مسلمان کا تذکرہ کیا تھا۔ اسلام میں معیار فضیلت جلد کی رنگت نہیں لیکن کفر کی سیاہی دل میں رکھنے والے گورے کو ایمان کی روشنی رکھنے والے کالے رنگ کے حبشی کی خاکِ پا سے بھی کیا نسبت ہوسکتی تھی۔

ان حالات میں اعلےٰ حضرت نے ہوش سنبھالتے ہی اس تحریک کی امامت کا منصب نبھایا جس کی روایت مولانا فضل حق خیرآبادی کے بعد فضل رسول بدایونی اور دیگر اکابر اہل سنّت نے اپنے اپنے علاقے میں اس دور پُر فتن میں بھی زندہ رکھی تھی۔

اس تحریک میں اعلےٰ حضرت نے علوم اعتقادی وعلوم آلاتی میں فضیلت حاصل کی جو تصانیف شائع کیں تحریری مناظرے اور فقہی استدلال سے اپنی برتری جس طرح اپنے حریفوں سے بھی تسلیم کروائی یا جس طرح اپنے کمال کو پہنچکر غلام آباد ہندوستان کا یہ سچا مسلمان مبلغ مکہ معظمہ" مدینہ منورہ اور اس وقت کی تمام قلمرو خلافت عثمانیہ کے فقہا و مشائخ سے قبولِ عام کی سند لیکر ہندوستان واپس آیا اور سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمۃ نے جس طرح دوست محمد خاں امیر کابل کی انگریزوں کی باجگذاری سے نجات کی تحریک سے لے کر کلکتہ میں جسٹس سیّد امیر علی مرحوم کی دو قوم کے نظریہ کی ابتدائی ہندوستانی تحریک تک یا پھر ایران سے لیکر مصر و شام قسطنطنیہ تک اور بعد ازاں وسط ایشیا کی روسی تسلط سے زبوں حال کثیر مسلمان آبادیوں تک عالمگیر اجماعیت ملت اسلامیہ کو تازہ کر کے حقیقی معنوں میں محی ملّت کے منصب اور لقب کا حق ادا کر دیا۔ نجد میں خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کے فتنے سے لیکر ہندوستان میں نیچریت وغیرہ کی اعتزالی وانحرافی تحریکیں اور یہاں سے وسط ایشیا میں بہائی اور بابی تحریکوں کو شرک فی الرسالت کے عقیدے سے منسلک ثابت کر کے ناخواندہ عامۃ المسلمین کے دلوں کی گہرائی تک یہ بات اتار دی کہ امکان نظیر رسالت یا امکان کذب باری تعالیٰ کی تحریکیں فقط نصرانیت و یہودیت کے پادریوں کے مابین پروٹسٹنٹ اور کیتھولک یا فریسی و صدوقی صیہونیت کے ربّیوّں اور احبار کی مناظرہ بازی اور کتب فروشی کے حیلے بہانے تک محدود نہیں بلکہ روسی زارئیت اور انگریز قیصریت نے مسلمانوں کے جہاد سے نجات پانے کے لئے آتش بازی کی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں

جن کی چنگاریاں سلطنت سے محروم اور مسجد و خانقاہ کی تربیت سے جلا وطن مسلمان خانہ برباد نونہالوں کے خرمن ایمان کے لئے کڑکتی ہوئی عسکریت کی بجلیوں یا عدالت سے مہاجن اور ساہوکار کی قرقی کی ڈگریوں سے اٹھنے والے جگر سوز شعلوں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

۱۸۷۰ء سے لیکر ۱۹۲۱ء[1] تک طول و عرض ظلمت کدہ ہند میں اعلیٰ حضرت کی تحریک تکریم رسالت اور انعقاد مجالس میلاد کی یہ تنظیم تھی جس نے ۱۸۵۷ء کے فتنے میں مسلمانوں سے تخت دہلی، اوقاف، دار العلوم اور مساجد میں انگریز کے گیت گانے والے (دردمندانِ ملت) کے علی الرغم پہلی مرتبہ عامۃ المسلمین کو ایسی تنظیم میں جو ۱۹۳۸ء میں پاکستان کی وکیل بننے والی مسلم لیگ کی پیدائش سے بھی قرنوں پہلے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد سے بھی قرنوں پہلے اور ۱۹۱۶ء میں لیگ کانگرس لکھنؤ پیکٹ اور مسلم لیگ کا نصب العین تاج برطانیہ کی وفاداری ترک کر کے آزادی قرار دینے سے قرنوں پہلے، حتیٰ کہ تحریک خلافت و تحفظ حرمین شریفین کے آغاز سے بھی قرنوں پہلے۔ مسجد کانپور میں گولی چلنے یا تقسیم بنگال اور پھر اسی تقسیم کی تنسیخ سے بھی بہت پہلے۔ دور دراز دیہات کے ان پڑھ دہقان مسلمانوں کے دل میں انمٹ حروف سے یہ نقش کر چکی تھی کہ مسلمان کی سیاست اس کے دین سے جدا نہیں اور کوئی مسلمان لیڈر یا پیشوا یا پیر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مکمل شریعت کے سوا کسی غیر قانون کے ماتحت مسلمانوں کو تابع نہیں کر سکتا۔ آخر وہ کیا غیبی طاقت تھی کہ جب مولانا محمد علی جوہر گاندھی کو اپنی جیب میں ڈال کر ہندو مسلم کی مشترکہ جے پکارتے پھرتے تھے یا جب مسٹر جناح قائد اعظم بننے سے پہلے ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۷ء تک بھی ہندوؤں سے تحفظ و مراعات حاصل کر کے مشترکہ قومیت کے زور سے انگریز کو نکالنا چاہتے تھے تو بار بار اور آخر کار ہر مسلمان

---

[1] یہ اعلیٰ حضرت کا سن وفات ہے۔ (مرتب)

لیڈر کو مسلمان عوام کی اس ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے کہ انگریز نے تو جبر و جور اور مکر و فریب سے مسلمان کو شکست دی تھی۔ رضا کارانہ سمجھوتے سے مسلمان سوائے خلافت کے اسلامی قانون کے اور کسی قسم کی مملکت کی اطاعت پر برضا و رغبت آمادہ نہیں ہو سکتے۔

روزنامہ کوہستان کے معروف کالم نگار مسٹر احسان نے ماضی قریب میں پروفیسر اشفاق علی خاں پرنسپل گورنمنٹ کالج کے زیر صدارت کسی مذاکرے کا یہ لطیفہ لکھا تھا کہ جب سارے قیام پاکستان کے مدعی، قدیم کارکن اپنی اپنی شان میں قصیدے پڑھ چکے تو کسی معصوم کالج کے طالب علم نے انجانے پن سے یہ سنم ظریفانہ سوال جڑ دیا کہ قبلہ گاہان! جب آپ پاکستان کی جنگ لڑنے کی فضیلت حاصل کر رہے تھے تو میں تو پیدا بھی نہ ہوا تھا لہٰذا آپ کی روایت کے سچ یا جھوٹ کے متعلق میرے پاس تو کوئی عینی شہادت موجود نہیں لیکن یہ الجھن اکثر مرے تپاک کے جذبات کو افسردہ کر دیتی ہے کہ جب آپ جیسی مقدس روحوں نے پاکستان اسلام کے نام اور پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے زور سے حاصل کیا تو کیا پہیلی ہے کہ قیام پاکستان کے مرحلے سے پہلے تو بیشک آپ اسلام پر عمل کرتے رہنے کی جتنی گنجائش تھی اس پر کاربند ہوں گے لیکن یہ کیا معمہ ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر آج تک اس ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے وہ اور تو سب کچھ ہو سکتا ہے اسلام یقیناً نہیں نہیں کہلا سکتا۔ کوہستان کے اس معروف کالم نگار نے اس حکایت کے بعد یہ لکھا کہ پاکستان کے قیام کے کارنامے سنانے والے سب مدعی اس سادہ سے سوال کے جواب میں یوں چپ سادھ گئے گویا کسی نے سوال سنا ہی نہیں۔ آخر صدر مذاکرہ پروفیسر اشفاق علی خاں نے استادانہ مہارت سے صورت حال کی نزاکت کو پہچانا اور سوال کا جواب دیا کہ برخوردار پاکستان کے قیام کے مدعی ہونے والے سب دعویدار ذرا تھوڑا سا مبالغہ کرتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ سرکاری نوکر فقط غیر مسلم حریفوں کے مقابلہ

میں ترقی یا اعلیٰ عہدے حاصل نہ کرنے سے تلملا رہے تھے۔ کارخانہ دار اور بنکوں
کے مالک ہندو مہاجن یا ساہوکار کے سود اور تجارت پر قبضے سے نالاں تھے۔ رہ
گئے لیڈر تو انہوں نے ہندو سے سمجھوتہ کر کے مشترکہ آزادی کے ذریعے ترقیاتی
منصوبے منڈھے چڑھانے کے لئے پورا زور لگایا تھا لیکن بقول اکبر الہ آبادی یہ
توصندی میںتا تھا جو مسجد کو چھوڑنے کے خیال سے ہی تھر تھرا جاتا تھا یا بقول
پروفیسر اشفاق علی یہ توصندی مولوی تھا جو اللہ اور رسول کے قانون کے سوا کسی
دوسرے مہذب نظامِ حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ
انگریز سوائے دونوں کی شہادت کے اور کسی بلند بانگ دعویٰ کو سننے کے لئے
اپنے ملک کی جمہوری رسوم کی بنا پر عادتاً ہی نہیں رکھتا تھا۔ پروفیسر اشفاق علی صاحب
نے تو تمام برصغیر میں مسلمانوں کی حمیت ناموس رسالت کو مولوی کے علامتی جھنڈے
تلے کھڑا کر دیا لیکن یقیناً (یہ مولوی کا بہتان) مولوی حسین احمد مدنی مرحوم کی مشترکہ
قومیت کی وکالت کی موجودگی میں ان کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد
نے تو بہت پہلے اپنی تفسیر میں وضاحت کر رکھی تھی کہ ہر دین میں کم و بیش سچائی موجود ہے۔
لہٰذا کسی بھی دھرم یا مت کے باطل اور معطل مطلق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
پھر یہ مولوی کا خطاب کس فریق پر صادق آتا ہے صاف ظاہر ہے کہ راسخ العقیدہ
قدیم مسلمانوں کے اجماع کثیر کی قیادت کرنے والے علماء حق ہی اس لقب کے مستحق ہو سکتے
ہیں۔ جیسا میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس قدیم راسخ العقیدہ ہندوستان میں سواد اعظم کی
فکری و دینی رہنمائی کا منصب تو سب سے زیادہ امام اہل سنت پر ہی پورا ہوتا ہے۔
تاریخی استناد کی تفصیلات تو تحقیق کا شوق رکھنے والے خود عصری مسلمان لیڈروں کے
بیانات اور اعلیٰ حضرت کے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے تاریخی فتویٰ تکفیر "جدید فرقہ گاندھویہ"
میں پڑھ سکتے ہیں۔ "فرقہ گاندھویہ" اعلیٰ حضرت کی وہ جامع و مانع سیاسی اصطلاح ہے جو

ہر نام نہاد اور مستقل مزاج "نیشنلسٹ مسلمان" کا احاطہ کر لیتی ہے۔

۱۹۲۰ء کا یہ فتویٰ دو قومی نظریہ کی تاریخی لحاظ سے شرعی بنیاد ہے۔

سر شفیع مرحوم نے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں، سر فضل حسین نے آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں، مولانا محمد علی جوہر کی پشت پناہی سے، اور پھر ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال نے انگریز پرست مسلمانوں کے ضعف استقامت سے بیزار ہو کر ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے لئے بتدریج جو سیڑھیاں طے کیں ان سب کی خشت اوّل اس فتویٰ ہی میں تھی جس کا لب لباب تمام متعلقہ آیات قرآنی بجمع احادیث اور کثیر فقہاء سلف کے اقتباسات نقل کرنے کے بعد یہ تھا کہ مسلمان ہر قسم کے کفار سے چاہے وہ مشرکین ہوں یا منکرین ہوں شرعی حدود کے اندر معاملات دنیاوی کے دائرے میں وہاں تک کر سکتے ہیں جہاں تک مسلمانوں کو فائدہ پہنچے لیکن کسی نوع کے کفار سے موالات جو سیاسی اقتصادی یا کسی اور وقتی مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے لیڈروں کو یا خود مسلمانوں کی اکثریت کو بھی قرین مصلحت محسوس ہو وہ نصوص شرعیہ قطعی سے ابداً ابداً ممنوع ہے۔ لہٰذا خلاف احکام الٰہی و سنّتِ رسول ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر کسی جدید اجتہاد یا اجماع سے استدلال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جس طرح پاکستان کی تحریک پر اجماع المسلمین لیگ کے کسی جلسے سے بھی زیادہ حتمی طور پر اس روز قبول عام سے ثبت ہو گئی تھی جب بغیر کسی رسمی کارروائی کے ملّت اسلامیہ نے مسٹر محمد علی جناح کو قائداعظم کی عملی سند وکالت سے مشخص کر دیا تھا، اس طرح امام اہل سنت اور ملت اسلامیہ برصغیر کا اجماع "اعلیٰ حضرت" کے لقب سے ثابت ہے جو بیساختہ اور بے تکلف اکابر شیوخ فقہا نے بطیب خاطر قبول کر لیا۔

مولوی محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم

مقالہ

محی الملت امام اہلسنت اعلیحضرت احمد رضا خاں صاحب کے یوم وصال کی تقریب فقط دینی لحاظ سے ہی اہمیت نہیں رکھتی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں دین و دنیا ایک دوسرے سے منقطع نہیں۔ اعلیحضرت کی مسلّمہ فقہی فضیلت سے علاوہ آپ کی ملی، عمرانی اور سیاسی خدمات بیسویں صدی عیسوی میں بے مثال ہیں۔ تذکرہ علماء ہند کا مصنف جو کہ مکتبۂ فکر کے لحاظ سے غیر جانبدار ہے اعلیحضرت کی تصنیف کے متعلق لکھتا ہے کہ ۔ انگریز کے عہد فتنہ انگیز میں اسلام کے اجماعی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جو نت نئے اعتزالی اور انحرافی فرقے زمانہ حال میں بدنام ہیں ان کا اصلاحی استیصال اور عالمانہ تردید اعلیحضرت علیہ الرحمۃ کا مخصوص کارنامہ ہے۔ اعتقادی اور آلاتی علوم متداولہ میں اعلیحضرت کی عظمت اس قدر بلند ہے کہ اس کا صحیح اندازہ اور قدر شناسی بھی نیم تعلیم یافتہ ذہنوں کے بس میں نہیں۔ معاصر اور متاخر علمائے منتہی بھی اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اعلیٰ حضرت کی قدر شناسی میں رطب اللسان ہیں۔

متاخرین میں بہت کم ہستیاں ایسی ہیں جو روحانی معارف کے ساتھ عقلی و نقلی علوم میں مہارت کاملہ حاصل کر سکیں۔ اعلیحضرت ان معنوں میں جامع الصفات

ہونے کے ساتھ ساتھ ربط عامہ کے لحاظ سے بھی یہ مقام رکھتے ہیں کہ برصغیر میں سواد اعظم کو ۱۸۵۷ء کے شاہ فضل الحق خیرآبادی کے فتویٰ جہاد کے بعد اعلیٰحضرت کی رسالت شناسی کی تحریک عامہ نے ہی ایک ملک گیر تنظیم میں جمع کیا جس طرح قیامِ پاکستان کی تحریک میں قبولِ عام کی سند "قائداعظم" کے لقب سے سیاسی دائرے میں مروّج کی گئی۔ اسی طرح محی الملت کے ابتلاء ۱۸۵۷ء کے بعد از سرِ نو اسلامی اجماعیت کو تازہ کرنے کا صلہ اعلیٰحضرت کے بے ساختہ لقب کے رواج عام سے ثبت دوام دیا گیا۔

چند روز ہوئے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل نے جو کہ ترقی پسندانہ فکر کے قلمی ترجمان کی حیثیت سے اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ایک مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ قیام پاکستان کے بعد اونچی نوکریاں یا کرسیاں حاصل کر کے تحریک پاکستان سے غافل ہو گیا۔ تجارت پیشہ و صنعت کار طبقہ ہندوؤں کے اقتصادی مقابلے سے نجات حاصل کر کے ملک کی دولت پہلے دوسو خاندان اور اب ماہرین کہتے ہیں کہ بیس قبیلوں میں جمع کر کے سمجھتا ہے کہ قافلہ منزل پہ پہنچ گیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ انگریزی اقتدار کے کاشت کردہ معاشرتی طبقات میں سے کسی کو پاکستان کی تحریک کا اصل محرک قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ فقط مولوی ہے جو مملکت کا مالک بن جانے اور دولت کی اجارہ داری منتقل ہو جانے کے بعد بھی مطمئن نہیں بلکہ شریعت مصطفویؐ کے نفاذ کاملہ کی پیاس اسے بے چین اور مضطرب رکھتی ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک پاکستان کا حقیقی محرک، بانی اور مبلغ آغاز سے انجام تک علمائے کرام اور مشائخ عظام کا طبقہ ہے تاریخ اس سچائی کی تائید کرتی ہے۔

پرنسپل صاحب نے علمی زبان میں تحریک پاکستان کا جو خلاصہ پیش کیا اس کا شخصی مرقع حضرت خواجہ الہ بخش صاحب تونسوی علیہ الرحمۃ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی علیہ الرحمۃ۔ حضرت مولانا غلام قادر صاحب بھیروی علیہ الرحمۃ۔ حضرت

خواجہ مستان شاہ صاحب کابلی علیہ الرحمۃ اور متاخرین میں اعلیحضرت کی ذات جامع صفات ہے۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے کہ جب ہم علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو راسخ العقیدہ علماء و مشائخ نے اچانک ہماری قسمت کا رخ پلٹ دیا۔

سنہ ۱۹۲۴ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۷ء تک قائد اعظم نے بار بار فرمایا کہ میں تو ہندو مسلم اتحاد سے آزادی کی منزل قریب تر لانے کے لئے جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے پر بھی آمادہ ہوں لیکن مسلمان قوم اپنے جداگانہ سیاسی وجود کے تحفظ کی ضمانت کے بغیر کسی سمجھوتے پر آمادہ نہیں سنہ ۱۹۲۰ء تک اس بے زبان اور "جداقومیت" کی زبان اور قلم کی واحد ترجمان" اعلیحضرت کی ایک ہزار سے زائد ضخیم یا مختصر تصنیفات اور رسالت محمدیہ کے مخصوص عالمگیر سیاسی مشن کی حرکات میں ظلمت کدہ ہند کے چپے چپے پر یا رسول اللہ کے نعرے کی گونج تھی، علماء کا یہی ورثہ تھا جس کا سنہ ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے سیاسی زبان میں یوں ترجمہ کیا تھا کہ اسلام بجائے خود ایک قائم بالذات تقدیر ہے۔ اس لئے وہ کسی اجنبی تقدیر کی ہم نشینی کا روادار نہیں۔

برصغیر کے ہر صوبے، ہر ضلع، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں اسلامی سواد اعظم کی مقامی اور مملکتی دینی امامت منصب استفتاء اور تدریسی علوم دینیہ کی مسند پر بیٹھنے والے اعلیحضرت کے شاگرد، ارادت کیش یا کم از کم ہم مسلک علما تھے۔ اس لئے اعلیحضرت اگر لفظاً نہیں تو معناً استاذ الکل متاخرین کا منصب رکھتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد تمام اسلامی فرقے اور مکاتیب فکر فقط ایک تنظیم میں اکٹھے ہوئے جس کی صدارت کیلئے متفق علیہ طور پر حضرت مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد صاحب قادری نور اللہ مرقدہ منتخب ہوئے۔ حضرت مولانا ابوالحسنات اعلیحضرت ہی کے فیض یافتہ

اور ارادت کیش تھے۔

یہ مولینا ابو الحسنات علیہ الرحمۃ صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی اور حضرت مصطفےٰ میاں صاحب خلف الرشید اعلیحضرت کے ساتھ ابن الحسنات حضرت پیر صاحب مانکی شریف، حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب اور سجادہ نشین سیال شریف خواجہ قمر الدین صاحب کے تعاون سے اعلیٰحضرت کی یادگار میں بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس سے تحریک پاکستان کے فروغ کے لئے سالہا سال کی بے مزد محنت شب و روزی کا نتیجہ تھا کہ جب ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب نے وہ تاریخی قطعہ شائع کیا کہ

زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

تو برصغیر کے طول و عرض سے اعلیٰحضرت کے یوں عددی سے بار بار پڑھائے ہوئے سبق ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

کا ایسا غلغلہ بلند ہوا جس سے راتوں رات امام الہند ابو الکلام سے لیکر جمعیت العلماء ہند کی بلند بانگ "وطن پرستی" ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور نام نہاد نیشنلسٹ مسلم سیاست کی نبضیں ہمیشہ کے لئے ڈوب گئیں۔

پیغامات

بسلسلۂ "یومِ رضا" منعقدہ ۲ جون ۱۹۶۸ء

- علامہ مفتی احمد یار خاں
- سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
- ڈاکٹر پیر محمّد حسن
- مفتی انتظام اللہ شہابی
- نعیم صدّیقی
- محمّد ایوب قادری
- بہزاد لکھنوی
- پیر صاحب بھرچونڈی شریف
- پیر صاحب بستی شریف
- پیر سیّد مغفور القادری
- مولانا عبد الحامد بدایونی
- سیّد ایّوب علی رضوی
- حافظ مظہر الدّین
- رئیس امروہوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ پیغامات کے بارے میں

جب مجلسِ صداقت اسلام کے زیرِ اہتمام "یومِ رضا" منانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ اس موقع پر بعض احباب نے یہ بڑا مفید مشورہ دیا کہ ملک کے نمایاں اہل علم حضرات سے رابطہ قائم کر کے "یومِ رضا" کیلئے پیغامات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مجلس کی طرف سے ایک چٹھی تیار کی گئی جسے متعدد فضلاء کی خدمت میں بھجوایا گیا۔ اس چٹھی کا مضمون، یہاں اس خیال سے نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیغامات میں کہی گئی باتوں کی تحسین کے لئے ایک پُر لطف پس منظر مہیا ہو گا۔

○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

گرامی مرتبت

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

اس عریضے کے ساتھ "یومِ رضا" کا مفصّل پروگرام بھی آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے جس سے آپ معلوم فرما سکیں گے کہ ۲؍جون ۱۹۶۸ء کو لاہور میں مجلس صداقت اسلام، مولانا شاہ احمد رضا قادری (بریلی) قدس سرہٗ کا یوم منا رہی ہے۔

ہمارا احساس یہ ہے کہ مولانا موصوف نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی

کے آغاز پر برِصغیر میں دینی علم و فکر کی اہم خدمات انجام دی تھیں، نیز مسلمانوں کے دینی و تہذیبی شعور کی تعمیر کے سلسلے میں وقیع کام کیا۔ عربی اور اردو میں علمی تالیفات کا ایک گراں بہا ذخیرہ بھی یادگار چھوڑا۔ حقیقت ہے کہ ہماری پچھلی ایک صدی کی علمی دینی و عمرانی تاریخ میں، یہ شخصیت ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے مگر شاید بعض اختلافی مباحث سے پیدا ہونے والی تلخیوں اور غلط فہمیوں کی بنا پر ابھی تک اس شخصیت کی طرف ہمارے ہاں علمی انداز میں مناسب توجہ نہیں کی گئی۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ آپ اس سلسلے میں اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ فرمائیں، نیز "یوم رضا" کے مذاکرۂ علمی کے لئے ایک مختصر سا پیغام بھی ارسال فرمائیں جو مجلس مذاکرہ میں پڑھا جائے گا اور بعد میں شائع بھی کیا جائے گا۔ آپ کی جانب سے یہ اعانت ہمارے نزدیک ایک ملّی خدمت متصوّر ہو گی، نیز ہم اپنے پروگرام میں اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں گے۔"

فقط والسّلام ....

صدرِ مجلس ......"

○

جن اصحاب علم و فضل کو یہ چٹھی ارسال کی گئی۔ الحمد للہ ان میں اکثر حضرات نے ہمارے جذبات اور پروگرام کو سراہا اور پیغامات بھی تحریر کر کے بھیجے۔ یہ پیغامات مجلس مذاکرہ میں پڑھ کر سنا دیئے گئے تھے اور اب اس مجموعۂ پیغامات کو اس کتاب میں شامل کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

ان پیغامات کی ایک اہمیّت یہ ہے کہ ان کے لکھنے والوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مسلک و مشرب کے اعتبار سے صاحبِ یوم (مولانا احمد رضا) کے ساتھ

ـــــــــــــ

[1] پیغامات سنانے کی خدمت ہمارے فاضل دوست سید محمد فاروق القادری نے نہایت احسن طریق سے انجام دی تھی

اختلاف رکھتے ہیں اور انہیں یہ بھی جتا دیا گیا تھا کہ یہ پیغامات پبلک میں پڑھے جائیں گے اور شائع کئے جائیں گے۔ اس کے باوجود ان سب لوگوں نے مولانا مرحوم کی علمی اور دینی عظمتوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ مختلف مکاتیب کے علماء کی طرف سے مولانا مرحوم کو یوں کشادہ دلی سے برملا خراج تحسین ادا کیا گیا ہے مثلاً

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پیغام سے یہ فقرے:

"مولانا احمد رضا خاں صاحب کے علم و فضل کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ فی الواقع وہ علوم دینی پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے"

اور جناب ایوب قادری (کراچی) کے پیغام سے یہ الفاظ:

"فقہ میں ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا ان کی فقہی جامعیت کا اندازہ ان کے فتاویٰ سے ہوتا ہے۔"

خصوصی طور پر قابل توجہ ہیں۔

دوسری اہمیت یہ ہے کہ ان مختصر تحریروں میں مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ کے مقام علمی و دینی اور ان کے مسلک کی صداقت سے متعلق بعض واضح اشارات، ایسے فیصلہ کن انداز میں محفوظ ہو گئے ہیں کہ اگر لوگ محض اپنے گروہی تعصب سے چمٹے رہنے کی قسم نہ کھائے بیٹھے ہوں تو انہیں اس شدید مخالفانہ رویے پر یقیناً نظر ثانی کرنی پڑے گی جو انہوں نے پچھلی نصف صدی سے مولانا مرحوم کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ آخر ایوب قادری انتظام اللہ شہابی، ابوالاعلیٰ مودودی اور نعیم صدیقی جیسے لوگ مولانا کی شخصیت اور ان کے مسلک و طریق کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں علمی اور تاریخی حقائق کے پیش نظر کہہ رہے ہیں، یہ لوگ تو مولانا کے اس حلقۂ عقیدت میں بہرحال شامل نہیں ہیں جس پر "اندھی عقیدتمندی" کا لیبل آسانی سے چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

آپ دیکھیں گے یہاں ایوب قادری جیسا مورخ صاف الفاظ میں کہتا ہے:

"فاضل بریلوی نے حنفیت کی بڑے زور و شور سے تبلیغ و اشاعت کی .... حقیقت یہ ہے کہ فاضل بریلوی خاتم الحکماء مولانا فضل حق خیر آبادی اور فضل رسول بدایونی کے سلسلے کی آخری کڑی تھے"

انتظام اللہ شہابی جیسا قاموس نگار محقق رقمطراز ہے:۔

"حضرت مولانا احمد رضا خاں مرحوم اس عہد کے چوٹی کے عالم تھے۔ جزئیات فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا ...... میرے دوست ڈاکٹر سراج الحق پی۔ ایچ۔ ڈی تو مولانا کے کلام کے گرویدہ ہیں اور مولانا کو عاشقِ رسول سے خطاب کرتے ہیں۔"

نعیم صدیقی جیسا ادیب و دبیر متعصبین کو یوں دعوتِ انصاف دے رہا ہے:۔

"مولانا شاہ احمد رضا جن کی یاد تازہ کرنے کے لئے اور جن کے افکار کو اجاگر کرنے کے لئے آپ نے مجوزہ تقریب کا پروگرام بھجوایا ہے ان کی تصانیف کا وسیع مطالعہ تو میں نہیں کر سکا البتہ کچھ چیزیں ضرور دیکھی ہیں۔ میرا خیال شاہ صاحب اور دوسرے نقطہ ہائے نظر کے علماء کے متعلق یہ ہے کہ ہمیں چاہیے کسی بزرگ کی کچھ باتوں سے اختلاف بھی ہو جب بھی علم اور تاریخ میں ان کا جو حصہ شامل ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔"

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابو الاعلیٰ مودودی جیسا شہیر اہل قلم بھی نزاع پسند مباحثین ہی کی کارروائیوں کو مولانا مرحوم کی خدمات و کمالات کو چھپائے رکھنے کا باعث قرار دیتا ہے۔

"نزاعی مباحث کی وجہ سے جو تلخیاں پیدا ہوئیں اور جن کا ذکر آپ نے خود بھی دعوت نامے میں کیا ہے وہی دراصل اُن (مولانا شاہ احمد رضا) کے علمی کمالات اور دینی خدمات

پر پردہ ڈالنے کی موجب ہوئی ہیں۔"
اور تیسری اہمیت ان پیغامات کی یہ ہے کہ ان میں بعض ایسے مختصر علمی اور تاریخی نکات مندرج ہو گئے ہیں جو کئی طویل و عریض تحریرات سے فی الواقع وقیع تر ہیں مثلاً پیر صاحب بھر چونڈی شریف نے تحریک خلافت کے ایام میں مولانا مرحوم کے ایک اہم فتوے کی کچھ تاریخ یوں بیان فرمائی ہے۔

"تحریک خلافت جس کا خمیر خاک پاک سندھ ہی سے اٹھا تھا جب کانگرس کی مکارانہ چالوں میں آکر ہجرت کا راگ الاپنے لگی اور سندھ کے عوام اپنے موروثی دینی جوش اور ملی جذبہ سے مجبور ہو کر اپنی جائدادیں جذبۂ ہجرت پر قربان کر کے کابل وغیرہ جانے لگے تو اس وقت میرے جد بزرگوار حضرت حافظ محمد عبداللہ صاحب قدس سرہٗ نے اس بارے میں مولانا احمد رضا خاں سے ہی رجوع فرمایا جنہوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں اس ہجرت کو غیر اسلامی قرار دے کر تحریک آزادی کا رخ انگریزی سامراج کے ساتھ ٹکرانے کی طرف موڑ دیا۔"

اسی طرح پیر سید مغفور القادری کے پیغام میں یہ الفاظ تاریخی حقیقتوں کی بالکل صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔

"سابق ہندوستان میں جب گاندھی ازم، کانگریس کی صورت میں اپنی بنیادیں استوار کر رہا تھا اور جس کی لپیٹ میں بڑے بڑے علمی ادارے اور نامور علما آکر اپنا دینی و علمی وقار کھو چکے تھے۔ یہی ایک ذات تھی جس نے سب سے پہلے میدان میں آکر ہندو ازم کو للکارا اور علما میں سب سے پہلے آپ ہی نے دو قوموں کا نظریہ پیش کیا۔ یہ اعلیٰحضرت کا وہ علمی کارنامہ ہے جس پر ہر پاکستانی صمیم قلب سے آپ کا

نبراس المجاہدین

حضرت پیر عبدالرحیم آف بھرچونڈی شریف

(سندھ)

دورِ انحطاط کا عظیم علمی و فکری رہنما

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں جب فرنگی سامراج اور برادران وطن کی عیاریوں سے ملت اسلامیہ کے بعض اعاظم رجال کی فکری اور علمی صلاحیتیں غلط رخ مڑ چکی تھیں اور انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کی نعرہ بازی نے عوام و خواص کو یکساں طور پر متاثر کر رکھا تھا، ایک ایسے مردِ میدان کی ضرورت تھی جو زوال پذیر مسلمان قوم میں صحیح اسلامی شعور اور ملی فکر بیدار کرکے اُسے صراط الذین انعمت علیہم پر چلانے کی مخلصانہ جدو جہد کرتا کوئی صائب الرائے اور ہوشمند انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایسے آڑے وقت میں مولینا شاہ احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ نے ملک و ملت کی جو اہم دینی و فکری اور علمی و ادبی خدمات انجام دیں، وہ برصغیر ہند و پاک کی فکری و تہذیبی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہیں۔ ہمارے اسلاف کرام بھی اہم مذہبی و فکری مسائل میں مولانائے مرحوم ہی سے رجوع فرمایا کرتے تھے تحریک خلافت، جس کا خمیر خاک پاک سندھ ہی سے اٹھا تھا، جب کانگرس کی مکارانہ چالوں میں آکر ہجرت کا راگ الاپنے لگی اور سندھ کے عوام اپنے موروثی دینی جوش اور ملی جذبہ سے مجبور ہو کر اپنی جائیدادیں جذبہ ہجرت پر قربان کرکے کابل وغیرہ جانے لگے

تو اس وقت میرے جدِ بزرگوار حضرت حافظ محمد عبداللہ صاحب قدس سرہٗ نے اس بارے میں مولنٰنا شاہ احمد رضا خاں سے ہی رجوع فرمایا جنہوں نے کتاب وسنت کی روشنی میں اس ہجرت کو غیر اسلامی قرار دے کر تحریک آزادی کا رخ انگریزی سامراج کے ساتھ ٹکرانے کی طرف موڑ دیا۔ جدِ بزرگوار نے یہ فتویٰ ملک کے طول وعرض میں مشتہر کرایا جس سے ہزاروں علمی اور دینی گھرانے تباہی سے بچ گئے اور وہ لوگ جو اس مزعومہ ہجرت کی بھینٹ چڑھ کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے اپنے ہی وطن میں رہ کر علمی ودینی خدمات کے ساتھ ساتھ انگریزی سامراج کا مقابلہ کرنے لگے۔ تحریک ہجرت کی ناکامی اور نتائج و عواقب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اعلیٰ حضرت کی دینی بصیرت اور سیاسی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ غرض مولانائے مرحوم کی ذات وشخصیت اور ان کی علمی و فکری تحریک ہماری تاریخ کا ایک ایسا حصہ ہے جسے ہزار حیلوں اور دجل و فریب کے باوجود فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

بہر زمین کہ نسیمے ز زلف او وزداست
ہنوز از سرِ آں بوئے عشق می آید

۲۷ مئی ۱۹۶۸ء

فقیر عبدالرحیم

۷۸۶
۹۲

سیّد الفقہا حضرت علاّمہ ابوالبرکات سیّد احمد دامت فیوضہٗ!

سیّدی و مولائی اعلیٰحضرت مولانا مفتی شاہ احمد رضاخاں قادری برکاتی قدس سرہٗ العزیز
اپنے دور کے جلیل القدر عالم دین اور شیخ طریقت تھے۔ اگرچہ وہ جملہ علوم معقول و منقول
میں امامت کے درجہ پر فائز تھے مگر فقہ ان کا خاص موضوع تھا اور اس فن میں پاک و ہند
میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔

پاک و ہند میں جس شاندار طریقے سے انہوں نے حنفیت کی علمی خدمات سر انجام دیں۔
وہ اپنی مثال آپ ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ عشق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا قیمتی اور
قابل قدر سرمایہ تھا۔ اس عہد کے جن کم سوادوں نے جذبۂ رسول کم کرنے کی سعی کی آپ نے
بلا خوف لومتہ لائم ان کی اس ناپاک سازش کو پوری طرح بے نقاب کر دیا۔

انگریز کی آمد کے ساتھ پاک و ہند میں دین کے نام پر جو فتنے پیدا ہوئے جن کا ردّ بلیغ حضرت
علاّمہ فضل حق خیرآبادی اور اس وقت کے دیگر علمائے حقانی نے فرمایا مگر ۱۸۵۷ء میں علمائے
اہل سنّت پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹنے سے یہ سلسلہ ایک مدّت کے لئے
ماند پڑ گیا۔ اس یاس و ناامیدی کے دَور میں اللہ تعالیٰ نے نَو پیدا شدہ مذاہب و فرق کے
استیصال اور تردید اور مذہب اہل سنّت والجماعت کی تائید کے لیے اعلیٰحضرت کو
منتخب فرمالیا۔ اعلیٰحضرت نے اس شان کے ساتھ اس خدمت کو سر انجام دیا کہ آج پاک و
ہند میں مذہب اہل سنّت اپنی اصلی حالت میں جو نظر آرہا ہے محض ان کے تجدیدی
کارناموں کا ثمرہ ہے۔

مجلس صداقتِ اسلام نے اعلیٰ حضرت کا یوم مناکر ایک اچھی اور قابل ستائش مثال قائم کی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بطفیل اپنے حبیب لبیب نبی کریم علی اللہ علیہ وسلم اراکین انجمن صداقت اسلام کو بیش از بیش مزید دینی خدمات اور تعلیمات اعلیٰ حضرت کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

فقیر قادری ابوالبرکات سیّد احمد غفرلہ
مفتی دار العلوم مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور
۲۸ صفر المظفر ۸۸ھ

۷۸۶
۹۲

شیخ التفسیر والحدیث

علامہ مفتی احمد یار خاں دامت برکاتہم!

عزیزم مولانا قاضی صاحب سلمہ وعلیکم السلام ثم السلام علیکم۔ آپ کے اشتہارات اور خط پہنچے۔ آپ نے اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے متعلق جو جلسہ کا انتظام کیا آپ کو مبارک ہو۔ اس خبر سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔ رب تعالیٰ آپ کو استقامت نصیب کرے ترقیاں دے اور آپ کو سنیت کا معیار بنادے۔ دین کی خدمت کی توفیق بخشے۔

والسلام

میں انشاء المولی الرحمٰن ۲۱ جمعہ کو دوسرے ہوائی جہاز سے ڈھاکہ روانہ ہوں گا غالباً دس بجے حضور داتا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پہ حاضری دوں گا۔ آپ سے ملاقات ہو جائے تو اچھا ہے۔

احمد یار خاں

۱۳ر جون ۱۹۶۸ء

سید ابوالاعلیٰ مودودی

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مولانا احمد رضا خاں صاحب مرحوم کے متعلق کوئی تفصیلی تاثر یا پیغام پیش نہیں کر سکتا۔ میری صحت ایک عرصے سے خراب چلی آرہی ہے اور گزشتہ چند روز سے میری طبیعت بہت خستگی محسوس کر رہی ہے کیونکہ میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ اور تحریک جمہوریت کے اجتماعات میں مسلسل شامل رہا ہوں۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب کے علم و فضل کا میرے دل میں بڑا احترام ہے فی الواقع وہ علوم دینی پر بڑی وسیع نظر رکھتے تھے اور ان کی اس فضیلت کا اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے جو ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ نزاعی مباحث کی وجہ سے جو تلخیاں پیدا ہوئیں اور جن کا ذکر آپ نے خود بھی دعوت نامے میں کیا ہے وہی دراصل ان کے علمی کمالات اور دینی خدمات پر پردہ ڈالنے کی موجب ہوئی ہیں۔ جن بزرگوں کی تحریروں کے باعث بحث و مناظرہ کی ابتدا ہوئی۔ وہ تو اب مرحوم ہو چکے اور اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے مگر افسوس ہے کہ جو تلخی اور گرمی آغاز میں پیدا ہوئی۔ دونوں طرف سے اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

آپ حضرات جنہوں نے مولانا مرحوم سے کسب فیض کیا ہے آپ کا یہ کام ہے کہ آپ ان تلخیوں کو دور کرنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں اور اختلافی مسائل میں مباحث سے بچتے ہوئے مولانا مرحوم و مغفور کے مثبت اسلامی افکار و

نظریات سے عامۃ المسلمین کو روشناس کرائیں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

۲۸ مئی ۱۹۶۸ء

عُمدۃ الکاملین سیّد مغفور القادری

دربارِ عالیہ شاہ آباد شریف گڑھی اختیار خاں رحیم یار خاں

مجلس صداقت اسلام کے نام "یوم رضا" کیلئے

اعلیٰحضرت حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان مبارک ہستیوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دینِ حنفہ کی صحیح رہنمائی کے لئے منتخب فرمایا۔ سابق ہندوستان میں جب گاندھی ازم کانگرس کی صورت میں اپنی بنیادیں استوار کر رہا تھا اور جس کی لپیٹ میں بڑے بڑے علمی ادارے اور نامور علما آکر اپنا دینی و علمی وقار کھو چکے تھے، یہی ایک ذات تھی جس نے سب سے پہلے میدان میں آکر ہندو ازم کو للکارا اور آپ نے ہی سب سے پہلے علماء میں دو قوموں کا نظریہ پیش کیا۔ یہ اعلیٰحضرت کا وہ علمی کارنامہ ہے جس پر ہر پاکستانی صمیم قلب سے آپ کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہے۔

مقام نبوّت، عظمتِ رسالت اور جذبۂ حبِّ رسولؐ، یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کو ہندوستان میں نہایت نازک حالات میں پوری شد و مد کے ساتھ اعلیٰحضرت نے اپنی مساعی اور کوششوں کا موضوع بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ جذبہ حب رسول سے اگر بے توجہی نہ برتی جاتی تو بعد میں آنے والے نیچری، قادیانی اور منکرین سنّت جیسے فرقوں سے ہمیں دوچار نہ ہونا پڑتا۔ اعلیٰحضرت اگر بروقت اس پر گرفت نہ کرتے تو ہندوستان کی مذہبی تاریخ شاید کسی اور طرح لکھی جاتی رہی اعلیٰحضرت کی شدت تو اُس وقت وہ جس تجدیدی کام کو لے کر اٹھے تھے۔ ان حالات کی روشنی میں شاید اس کے بغیر چارۂ کار نہیں تھا۔ آخر تاریخ میں دوسرے بزرگوں نے بھی تو بعض مقامات پر یہ طریق کار اختیار کیا ہے

اعلیٰ حضرت اور اکابرین دیوبند کی باہمی چپقلش کسی ذاتی پرخاش کا نتیجہ تو نہیں تھی کہ اسے قابل مذمت قرار دیا جائے البتہ بعد میں اس کو مستقل اکھاڑا بنا لینا ضرور قابل مذمت ہے اور اس کی ذمہ داری ہر دو گروہوں پر عائد ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت کا علمی مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تقریباً پچاس مختلف علوم میں ان کی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہر موضوع پر ان کی کتابیں متن کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی ناقابل معافی فروگزاشت ہوگی۔ اگر ہندوستان کے اتنے بڑے عالم، مفکر، مصنف، نعت گو اور سیاسی مدبر انسان کی زندگی کو صرف فکر و نظر کے اختلافات کی وجہ سے گمنامی کے گوشے میں پھینک دیا جائے مجھے خوشی ہے کہ مجلس صداقت اسلام، مشاہیر کے کارناموں کی اشاعت و تبلیغ کا انتظام اعلیٰ حضرتؒ کے یوم سے شروع کر رہی ہے۔ اراکین مجلس تہ دل سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجلس کو مزید دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

دستخط

سید مغفور القادری

حضرت مولانا الحاج میاں علی محمد صاحب
سجادہ نشین بسی شریف
پاکپتن شریف

صدر انجمن صداقت اسلام لاہور نے جو جناب احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یوم عرس منا رہے ہیں فقیر سے خواہش کی ہے کہ اس موقع پر ایک پیغام ارسال کروں۔ لہٰذا گزارش ہے کہ جناب محترم مولانا احمد رضا خاں صاحب قادری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اہل سنّت والجماعت کے جیّد عالم با عمل تھے اور انہوں نے اس مسلک حق کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی کوشش کی ہے اور بحیثیت مجموعی دین حق کی حمایت میں اتنا بڑا کام کیا ہے کہ پوری انجمن سے بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسے علمائے حق کا یوم عرس منانا مبارک کام ہے۔ اللہ تعالیٰ انجمن صداقت اسلام کے کارکنوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

الداعی
علی محمد

یکم مئی ۶۸ء

محترم الحاج سیّد ایوب علی رضوی بریلوی

انجمن صداقت الاسلام لاہور نے یوم اعلیٰ حضرت منانے کا وسیع پروگرام مرتب کر کے ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ آج اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ سیّدی و مولانائی اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قدس سرہ العزیز کی تعلیمات کی عام اشاعت کی جائے اور اُن کی تصانیف کو بہت اچھے انداز میں چھپوا کر اہل علم کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ اعلےٰ حضرت کس پایہ کے عالم دین اور کس درجے کے روحانی پیشوا تھے اور ان کی دینی و ملّی خدمات کیا ہیں

دستخط

سیّد ایوب علی رضوی

شیخ الادب ڈاکٹر پیر محمد حسن

مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ خط ملا۔ قدرے خوشی ہوئی کیونکہ اس اطلاع سے یہ اندازہ ہوا کہ ہماری جماعت مردہ نہیں ہو چکی ابھی کچھ جان باقی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ مصروفیت کے باعث اس مبارک تقریب میں حاضر نہ ہو سکوں گا۔ ارشاد کے مطابق مختصر سا پیغام جناب کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اس قسم کی تقاریب آئندہ بھی جاری رہیں گی۔

والسلام
محمد حسن

یوم رضا منائے جانے کی اطلاع ملی۔ مدت سے میں سوچا کرتا تھا کہ ہمارے احباب کی بے حسی انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ اپنے بزرگوں کی یاد تازہ رکھنے کی کبھی انہیں فکر ہی نہیں ہوتی۔ ہر فکر و ہر مکتب کے لوگ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں مگر وہ ہستی جس نے امت کے اندر ایک تازہ روح پھونکی جس نے اپنی تقریر اور تحریر سے جہاد کیا اور مضبوط دلائل اور قوی براہین سے باطل کو پاش پاش کر دیا۔ اس کا نہ کبھی ذکر ہوتا ہے اور نہ اس کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ زمانے کے گزرتے گزرتے مدتیں گذر جاتی ہیں اور جوں جوں مدت گزر جاتی ہے اسی قدر ماضی پر گرد جمتی رہتی ہے۔ اس گرد کو دھونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے رفتگان کا بار بار ذکر کیا جائے۔ باطل کی تو یہی خواہش ہو گی کہ یہ گرد جمتے جمتے تودۂ بزرگ بن جائے اور حق اس کے نیچے ایسے دبے کہ پھر ابھرنے کا نام تک نہ لے مگر اہل حق پر یہ فرض عائد

ہوتا ہے کہ وہ اس کی اشاعت کریں اور اسے تازگی بخشیں۔

یہ امر باعث مسرت اور باعث صد تشکر ہے کہ احباب کو حضرت مولانا احمد رضا شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا دن منانے کا خیال آیا۔ مولانا کا علم، زہد اور تقوی کسی پر مخفی نہیں ہے مجھے بعض ایسے لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملا ہے جو مولانا کے شدید ترین مخالفین میں سے ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کے بزرگ مولانا کی علمی قابلیت کے معترف تھے۔ یہ ہے وہ جادو جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔

بعض لوگوں نے تصانیف کی ہیں مگر ان کی تصانیف کے متعلق خود ان کے معتقدین کا یہ کہنا ہے کہ عوام تو کیا علما بھی انہیں نہیں سمجھ سکتے۔ تصنیف کا مقصد دوسروں تک اپنی بات کا پہنچانا ہوتا ہے اگر کوئی سمجھ ہی نہ سکے تو مقصد معدوم ہو گیا اور تصنیف بیکار ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں میں اہلیت ہی نہ تھی کہ اپنا مافی الضمیر دوسروں تک موزوں الفاظ میں پہنچا سکیں۔ برعکس اس کے یہ بات مولانا کی تصانیف میں نہ تھی۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے دقیق علمی مسائل پر قلم اٹھایا مگر ایسے واضح الفاظ میں انہیں سمجھایا کہ عالم اور غیر عالم دونوں یکساں مستفید ہو سکیں۔ مولانا جس قدر زود نویس تھے اس کا پتہ ان کی لاتعداد تصانیف سے چلتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ علم کا سمندر ان کے سینہ اور دماغ میں موجزن تھا اور اس کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ رد کنے اور رکنے کی گنجائش نہیں تھی۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ "جو تصانیف میں نے کی ہیں ان سے میرا مقصد مصنف بننا نہیں ہے بلکہ اگر میں یہ تصانیف نہ کرتا تو مجھے جل جانے کا خطرہ تھا"۔ یہی بات مولانا پر صادق آتی ہے۔ آپ کے دل میں اعلائے حق کا جذبہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح کھول رہا تھا اس کا اظہار ضروری تھا تاکہ جس پر یہ لاوہ پڑے اسے جلا کر راکھ کر دے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے مراتب اور بلند کرے۔ آمین

محمد حسن

۴۸۶
۹۲

مولانا عبدالحامد بدایونی (کراچی)

جاننے والے بخوبی واقف ہیں کہ حضرت مولانا احمد رضاخاں صاحب بریلوی اور حضرات علمائے بدایوں میں دیرینہ روابط تھے۔ دونوں خاندان مدینہ طیبہ اور بغداد معلیٰ سے نسبت رکھتے تھے اور ان دونوں خانوادوں کو خاص خدمتوں پر ان کی حیثیت سے مامور فرمایا گیا۔

مولانا احمد رضاخاں صاحب بریلوی جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے ان کا حلقہ درس ایک موجیں مارتا ہوا سمندر تھا۔
حدیث پاک ہو یا تفسیر فقہ ہو یا علم کلام منطق ہو یا فلسفہ تاریخ ہو یا ادب، علم نجوم ہو یا علم حساب وریاضی، ان تمام علوم پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو کامل طور پر عبور خاص تھا۔
مولانا احمد رضاخاں صاحب نے نہ صرف یہ کہ سارے علوم و فنون پڑھائے بلکہ ہر ایک علم پر مبسوط رسائل اور لاجواب تصانیف مرتب فرمائیں۔ بارگاہ رسالت کا عشق ان کی رگوں میں موجزن تھا۔ وہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی اولاد امجاد، حضرات اولیا اللہ کے گستاخوں بے ادبوں کے مقابلے پر شمشیر حق وصداقت تھے۔

اس وقت کے نوزاد فرق باطلہ اور دیگر بدمذہبوں کی تردید میں انہوں نے کئی سو سے زیادہ لاجواب تصانیف وتالیفات چھوڑیں جو ملت اسلامیہ کے لئے راہنما کا کام دیتی ہیں۔

فاضل بریلوی نے محنت شاقہ فرما کر قرآنِ کریم کا ترجمہ اور تفسیر مرتب فرمائی جوان کا شاہکار ہے۔ مسائل فقہیہ پر ان کی نظر کافی تھی۔ فتاویٰ رضویہ آپکا مکمل و مشہور فتاویٰ ہے جس میں ہر قسم کے مسائل جمع ہیں۔

ملت اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ بدایوں اور بریلی کی تالیفات و تراجم اور علمی خدمات کو بطور مثال اپنے سامنے رکھ کر زندگی کے مسائل میں راہنمائی حاصل کرے۔

میں مجلس صداقتِ اسلام لاہور کو مبارکباد دیتا ہوں جو حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا "یوم رضا" منا رہی ہے۔

میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کے نوجوانوں میں اسلام کی روح بڑھائے تاکہ وہ اکابر علماء و اہل اللہ سے مستفید ہو سکیں۔

والسلام

محمد عبد الحامد القادری البدایونی

۷۸۶
۹۲

جناب مفتی انتظام اللہ شہابی

مکرمی قاضی عبد النبی صاحب کوکبؔ ایم ۔ اے نے ناچیز سے بھی یہ خواہش کی کہ یوم رضا کے انعقاد کے متعلق اپنے تاثرات عرض کروں ۔ کوکبؔ صاحب اور اراکین مجلس صداقت اسلام لاہور کا یہ مبارک اقدام قابل تحسین ہے کہ وہ بزرگانِ اسلام کی یادگار کی تقریب منعقد کرتے ہیں ۔ صوفیائے کرام کی عرس کی صورت میں سالانہ یادگار معتقدین مناتے رہتے ہیں ۔ اہل ادب شعراء کے یوم مناتے ہیں مگر عظیم المرتبت علماء کرام کے یوم منانے کی سخت ضرورت ہے ۔

ہماری اس صدی میں بھی اکابر اسلام پیدا ہوئے اور اپنے علمی کارنامے چھوڑ گئے مگر ہماری قوم نے ان کو بھلا دیا مگر یوم رضا منا کر معلوم ہوتا ہے کہ اب علمائے کرام کے یوم منانے کی تقریب کے سلسلہ کا آغاز ہو گیا ۔

حضرت مولانا احمد رضا خاں مرحوم اس عہد کے چوٹی کے عالم تھے ۔ جزئیات فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا ۔ قاموس کتب اردو جو ڈاکٹر مولوی عبد الحق مرحوم کی نگرانی میں مرتب کی ہے ۔ اس میں مولانا کی کتب کا ذکر کیا اور اس پر نوٹ بھی لکھے ۔ ترجمہ کلام مجید اور فتاویٰ رضویہ وغیرہ کا مطالعہ کر چکا ہوں ۔ مولانا کا نعتیہ کلام پُر اثر ہے ۔ میرے دوست ڈاکٹر سراج الحق پی ۔ ایچ ۔ ڈی تو مولانا کے کلام کے گرویدہ ہیں اور مولانا کو عاشقِ رسولؐ سے خطاب کرتے ہیں ۔

مولانا کی دینی معلومات پر گہری نظر تھی ۔ ۱۹۲۲ء میں ڈیرہ گام ..... جانے کا اتفاق ہوا ۔ وہاں کے دار العلوم کے صدر مدرس مولانا غلام محی الدین غزنوی سے ملاقات

ہوئی۔ وہ مولانا احمد رضا خانصاحب کے فضل و کمال کے بڑے معترف تھے۔ مولوی دیدار علی الوری مرحوم آگرہ میں مفتی شہر تھے، راقم سطور سے گہرے تعلقات تھے، وہ بھی مولانا کے بڑے مداح تھے، ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے نام سے ایک دار العلوم قائم کیا جائے علاوہ ازیں کوکب صاحب اور مکرمی حکیم محمد موسیٰ صاحب مولانا کے حالات لکھ کر بھیجدیں آج کل قاموس الاعیان زیر ترتیب ہے۔ اس میں درج کر دوں۔

والسلام

انتظام اللہ شہابی

۷۸۶
۹۲

جناب محمد ایوّب قادری (کراچی)

مخدوم و محترم جناب قاضی صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آنجناب کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ میری طرف سے مندرجہ ذیل پیغام قبول ہو۔ فقط والسّلام

"علامہ فاضل مولانا احمد رضا خاں بریلوی، چودھویں صدی عیسوی کے نامور عالم اور مصنّف تھے۔ ان کی تمام تر زندگی تصنیف و تالیف اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں گزری اور انہوں نے اپنے پیچھے تصانیف کا ایک گرانقدر ذخیرہ چھوڑا ہے جس کا بیشتر حصہ علم کلام عقائد اور فقہ پر مبنی ہے اگرچہ فاضل بریلوی تمام علوم متداولہ میں مہارت کاملہ رکھتے تھے مگر فقہ میں ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ ان کی فقہی جامعیت کا اندازہ ان کے فتاویٰ سے ہوتا ہے۔

فاضل بریلوی نے حنفیت کی بڑے زور شور سے تبلیغ و اشاعت کی اور اس میں اُن کو اس قدر شہرت ہوئی کہ وہ ایک مکتب فکر کے بانی قرار پائے حقیقت یہ ہے کہ فاضل بریلوی، خاتم الحکما، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا فضل رسول بدایونی کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔

بڑی مسرت ہے کہ مجلس صداقت اسلام (لاہور) نے مشاہیر و علماء کی یاد تازہ کرنے کا ایک جامع منصوبہ بنایا ہے جس کا آغاز فاضل بریلوی کے یوم منانے سے کیا جا رہا ہے، خداتعالیٰ مجلس کو ہر مرحلے پر کامیابی عطا فرمائے۔" فقط

محمد ایوب قادری

۷۸۶
۹۲

مَدّاحِ رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن

جناب حافظ مظہر الدّین

محبّ مکرّم سلام مسنون

اعلیٰ حضرت بریلوی قدس سرہ العزیز کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے نہ وقت ہے نہ صلاحیت۔ حضرت کا وجود آیات الٰہیہ میں سے تھا جو کام آپ سر انجام دے گئے ہیں وہ تائیدِ ربّانی کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ نے عشق کو فروغ بخشا۔ محبت کو نئی زندگی عطا کی اور روحوں میں وہ مستیاں بھر دیں جو سرمدی ہیں ازلی ہیں ابدی ہیں جو کبھی فنا نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان کا تعلق اس ذات قدسی صفات (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہے جو اوّل ہے آخر ہے ظاہر ہے اور باطن ہے۔ عشق و محبت کا یہ قاسم جسے دنیائے محبت مولٰنا احمد رضا خاں صاحبؒ بریلوی کے نام سے موسوم کرتی ہے یوں تو رب تعالیٰ کی برہان تھا۔ اس کی فطرت باطل سوز تھی۔ وہ باطل کے خرمن پر برق خاطف بن کر گرا۔ دلیل و حجت کا جو اسلحہ لیکر حریف اس کے سامنے آئے اس نے ان کا سارا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور وہ تنہا تھا لیکن آج تک وہ اپنے علم و فضل کے تمام تر دعوؤں کے باوجود اس کی کسی دلیل کو نہیں جھٹلا سکے اس نے محبت کا جو نقش فروزاں کیا تھا وہ اب بھی اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ قائم ہے اور دلوں کو زندگی عطا کر رہا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ انہوں نے نبوّت کا مفہوم آشکار کیا۔ رسالت کے معانی و مطالب سمجھائے اور محبوبیت کی شان آشکار کی۔ اگر وہ اتنی عظیم کتابیں نہ بھی لکھتے قرآنِ حکیم کے صحیح معانی و مطالب

نہ بھی بیان کرتے، معترضین کے اعتراضات کے جوابات نہ بھی دیتے صرف اپنا عشق و مستی سے معمور نعتیہ کلام ہی چھوڑ جاتے تو یہی احسان کوئی کم نہ تھا لیکن انہوں نے تو ہر محاذ پر باطل کو شکست دی۔ ان کی یہ کتنی عظیم کامیابی ہے کہ نعت کے محاذ پر ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا، ہر جگہ ان کے نعتیہ نغمے گونج رہے ہیں۔ ان کی ذات کی طرح ان کی آواز بھی منفرد ہے۔ بے مثل اور یکتائی کی حامل ذات کی مدح خوانی نے انہیں بھی یکتائی عطا کر دی ہے۔ فلسفی اور منطقی اس محاذ پر گونگے ہیں اور احمد رضا خاں گویا' وہ خاموش ہیں اور یہ زمزمہ سرا' اس کی زمزمہ سرائی عشق و محبت کے نئے نئے جہانوں کی خالق بن رہی ہے اور عشق و محبت کے ان نو رسیدہ جہانوں کے افق پر اس کی محبت کے کتنے آفتاب و ماہتاب چمک رہے ہیں۔ تجلیاں بکھیر رہے ہیں' نور عطا کر رہے ہیں۔

برادر مکرم! آپ جو عزم لیکر اٹھے ہیں وہ بڑا مبارک ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ اگر مجھے مکروہات حیات سے فرصت ملے تو میں حضرت کے نعتیہ کلام کے محاسن پر دل کھول کر لکھوں' معلوم نہیں زندگی میں یہ آرزو پوری ہو گی بھی یا نہیں۔ لیکن یہ عزم ہے ضرور۔ بارہا میں اپنی تنہائیوں میں یہ سوچتا ہوں کہ جو شخص اعلیٰ حضرت کی ذات اور ان کے ولولہ انگیز کارناموں کو اپنے فکر و خیال کا موضوع بنا دے گا اور ان پر تفصیل سے لکھے گا وہ کتنا عظیم الشان ہو گا۔ عظمتیں اس کے جلو میں ہوں گی۔ رحمتیں اس کا طواف کریں گی۔ میری موت کے بعد اگر وہ عظیم انسان آئے تو اسے میرا سلام پہنچا دیجئے' میری روح اس کے استقبال کے لئے' مضطرب اور پریشان ہے۔ میں اس کا منتظر ہوں۔ یہ حادثہ کتنا المناک ہے کہ خدا کے کسی بندے نے ابھی اس موضوع پر کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ باطل پرست اپنے ذرّے کو آفتاب بنا کر پیش کر رہے ہیں اور ہم نے آفتاب کی تجلیوں کو بھی در خورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اعلیٰ حضرتؒ کا پیام اگر ابھی تک زندہ ہے تو محض اس لئے کہ وہ فطرت کا پیام ہے۔ عشق کی آرزو ہے جو مٹ نہیں سکتی۔ ورنہ ہم نے تو اس سلسلے میں کوئی کارنامہ

سرانجام نہیں دیا۔

محترمی! آپ اس باب میں جو قدم بھی اٹھائیں گے یا جو عزائم رکھتے ہوں اُن سے مجھے ضرور مطلع فرمائیے شاید میں بھی کسی کام آسکوں، یا کم از کم میرے جذبات عقیدت و محبت کو تسکین ہی مل سکے۔ ایک مضطرب روح کو تسکین دے دینا بھی کوئی کم سعادت نہیں ہے۔

والسلام

مظہر الدین

مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۶۸ء

۴۸۶
۹۲

جناب نعیم صدیقی

محترمی مولانا کوکب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جس مجلس میں آپ اور دوسرے فاضل حضرات کو اپنے رموز علم سے شائقین کو بہرہ مند کرتا ہے اس میں مجھ ایسے کم علم اور کوتاہ عمل آدمی کے پیغام کا کیا مقام!

مجھے "یوم رضا" کے پروگرام اور اس سے پہلے کی ان مجلسی و علمی سرگرمیوں کا جتنا کچھ علم رہا ہے جن کے پیچھے آپ کا جذبۂ بے تاب کام کرتا ہے، ان کو میں اس لحاظ سے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں کہ آپ اعتقادی اور فقہی اختلافات کی خلیج کو پاٹ کر مختلف عناصر کو اسلام کے عظیم تر تعمیری تقاضوں کے لئے قریب لا رہے ہیں۔

مولانا شاہ احمد رضا جن کی یاد تازہ کرنے کے لئے اور جن کے افکار کو اجاگر کرنے کے لئے آپ نے مجوزہ تقریب کا پروگرام بھجوایا ہے ان کی تصانیف کا وسیع مطالعہ تو میں نہیں کر سکا۔ البتہ کچھ چیزیں ضرور دیکھی ہیں۔ میرا خیال شاہ صاحب اور دوسرے نقطہ ہائے نظر کے علماء کے متعلق یہ ہے کہ ہمیں چاہیے کسی بزرگ کی کچھ باتوں سے اختلاف بھی ہو، جب بھی علم اور تاریخ میں ان کا جو حصہ شامل ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ نیز تعمیری نقطۂ نظر میں اس کو سمجھتا ہوں کہ ہم مختلف مدارس فکر کی شخصیتوں کو اپنے خاندان ملت کے شرکاء مان کر ان کی اچھی باتوں سے استفادہ کریں اور اگر کچھ باتیں ہمارے معیاروں پر پوری نہ اتریں تو ان کو اچھالنے اور ان کو ذریعۂ نفرت و نزاع بنانے کے بجائے ان سے صرف نظر کریں۔ یہ نقطۂ نظر ایسے عناصر کے متعلق نہیں جو توحید یا منصب رسالت یا ختم نبوت یا کسی اور بنیادی عقیدے کو مجروح

کرکے جداگانہ راستہ نکالنے والے ہوں۔

میں آج کے الحاد پرور ماحول کو سامنے رکھ کر یوم رضا کیلئے اپنا یہ ناچیز پیغام دیتا ہوں کہ خدا کرے کہ اس تقریب کے ذریعے اور ایسی ہی مختلف کوششوں کے ذریعے اسلام کا ایمانی روحانی اور اخلاقی محاذ اتنا مضبوط ہوجائے کہ مادیت کی یورش کا کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکے

صدر مجلس، فاضل مقررین اور سامعین سب کی خدمت میں میرا ہدیہ سلام مسنون۔

نعیم صدیقی

۲۵ مئی ۶۸ء

۷۸۶
۹۲

جناب رئیس امروہوی

مکرمی سلام مسنون!

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ یوم رضا کا انعقاد قابل تبریک ہے۔ چند سطور حسب الحکم ارسال ہیں۔

برّ کوچک کی تقسیم کے بعد علم و ادب، عرفان و تصوف کے نہ جانے کتنے چاند سورج سرحد پار رہ گئے۔ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی محبوب ترین اور مقدس شخصیت نے برّ کوچک کے مسلمانوں اور خداشناسوں کی تنویر فکر میں جو روشن حصہ لیا ہے اور جس طرح ممدوح نے اپنی حیات مستعار میں لاکھوں روحوں کو گرمی اور لاکھوں دلوں کو سوز و ساز کی دولت بخشی ہے۔ اس کی شرح و توضیح کے لئے ایک دفتر ہی نہیں نہ جانے کتنے دفاتر معانی کی ضرورت ہے۔ مجھے حضرت کی آستان بوسی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بارہا جسمًا اور روحًا مزار پُرانوار پر حاضر ہوا ہوں۔ کیا عجیب کیفیت ہے اس منزل مبارک، اس خوابگاہ قدس اور اس روضۂ مقدسہ (من ریاض الجنۃ) کی حضرت مولانا شاہ احمد رضا بریلویؒ آفتاب علم و معرفت تھے۔ بظاہر یہ آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ بریلی کی سرزمین خوش نصیب ہے کہ اب تک اس آفتاب عالمتاب روحانیت کی شعاعوں کی پرتو اندازی کر رہی ہے چشم مشتاق اس پرتو سے غرق تجلیات سہی تاہم جی چاہتا ہے کہ پاکستان میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے ایک ایسا مرکز علم و عرفان وجود میں آئے جس کا انتساب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پاک سے ہو

اراکین مجلس صداقت اسلام قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے "یومِ رضا" کے انعقاد کے سلسلے میں اس منزل کی طرف قدم اٹھایا ہے لیکن یہ صرف پہلا قدم ہے ؎

راہے کہ طویل است بیک گام نباشد

مجھے امید ہے کہ اراکین مجلس یوم رضا کے انعقاد پر ہی نہ ٹھہر جائیں گے اور حضرت قدس اللہ سرہ العزیز کی تصانیف وتالیفات (روایت ہے کہ ہزار رسالے آپ کے قلم مبارک سے نکلے ہیں) کی طباعت اور تعلیمات کی اشاعت کا بیڑہ اٹھائینگے!

منزل تو نہ ہمیں منزل مجنوں باشد
اے کہ لیلیٰ صفتی ناقہ ومحمل خواہم

۲۵ر مئی ۱۹۶۸ء

رئیس امروہوی

۷۸۶
۹۲

جنابِ بہزاد لکھنوی

حضرت گرامی ۔ سلام مسنون ۔

آپ کا والانامہ مجھے آج ۱۴ر جون کو ملا ۔ میں ۱۸ یوم کے بعد آج ابھی کراچی پہنچا ہوں ۔ مجھے والانامہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا ۔ میں یکم جون سے لاہور ہی میں تھا ۔ اور ۸ ر جون تک وہیں رہا ۔ کاش مجھے علم ہوتا تو میں بذاتِ خود آپ کی محفل میں شرکت کے بعد ثوابِ دارین حاصل کرتا ۔ خط کی مہر سے معلوم ہوا کہ یہ والانامہ یکم جون کو کراچی پہنچا شاید قبل سے یاد فرما لیتے تو میں اس سعادت سے محروم نہ رہتا ۔

وقت گزر چکا ہے ۔ اب بھی اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے اپنا ادنیٰ خادم تصور فرمائیں ۔

آپ کا
بہزاد لکھنوی

۱۴ر جون ۶۵ء

قطعہ تاریخ وفات

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مولانا مفتی شاہ احمد رضا خاں صاحب

سُنی حنفی قادری برکاتی بریلوی قدس اللہ سرہ العزیز

از سید شریف احمد شرافت قادری نوشاہی سجادہ نشین ساہنپال شریف (گجرات)

جناب حضرتِ ذی المناقب
امیرِ عارفاں آں مرد سجاد

امامِ اہلِ سنت والجماعت
رئیس فاضلانِ اہلِ ارشاد

فقیہہ ملتِ بیضائے اسلام
گروہ اصفیارا پیر و استاد

حکیمِ اُمتِ احمد رضا خاں
کہ بودہ در جہاں سلطانِ اوتاد

پدرِ ابنِ مصطفےٰ مفتیِ اعظم
شدہ دور از ظہورش کفر و الحاد

بہ تجدید شریعت خوب پرداخت
درے از فیض بر آفاق بکشاد

ز عشاقِ جنابِ غوثِ اعظمؒ
فریدالدہر بودہ فردِ افراد

طریقت شرع و عرفان و حقیقت
ز انفاسِ شریفش گشت آباد

مجاہد بود در زہد و ریاضت　　بکشف و ہم کرامت بود معتاد
ہمہ اوقاتِ خود معمور میداشت　　بہ تصنیف و بہ تدریس و بہ اوراد
محدّث ہم مفسّر شیخ عالم　　فنا والیش شدہ مقبولِ امجاد
وصالِ ذاتِ حق چوں خواست از دل　　ازیں دنیا بعقبےٰ روئے بنہاد
بروزِ جمعہ آں یکتائے دوراں　　زبندِ دارِ فانی گشت آزاد
بہ بست و پنجم از صفر المظفر　　بفردوسِ معلّےٰ گشت دل شاد

شرافت جست تاریخِ وصالش
خرد گفتا بگو۔ مغفورِ جوّاد

۱۳۴۰ھ

قطعہ ثانیہ

فقیہہِ زماں شاہِ احمد رضا — زافرانِ خود بود والا قدر

بعلم و فضیلت شدہ بے مثال — بمعقول و منقول صاحب نظر

مجدّد بشرعِ متینِ نبی — ازو زندہ شد سُنّتِ با اثر

گریزان ازو اہلِ بدعت تمام — فروزاں ازو دینِ خیر البشر

تصانیفِ اُو مشتہر در جہاں — بافضال و اجلال والا گہر

شرافت ز ترحیل وے فکر کرد

ندا شد ز دل۔ ہادی مفتخر

۱۳۴۰ھ

قاضی عبدالنبی کوکب کی دیگر تصنیفات

○ **مقالات یوم رضا** (حصہ اول) اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ کی شخصیت اور خدمات پر پہلی فکر انگیز علمی کتاب
ھدیہ ۲ روپے ۷۵ پیسے

○ **زندگی کی راہیں قرآن میں** قرآن حکیم سے ایک مختصر اور جامع نصاب، جس میں عملی زندگی سے متعلق آیات جمع کی گئی ہیں طلبۂ و طالبات کی دینی تربیت کے لئے اور درس قرآن کی خدمت انجام دینے والے اساتذہ اور مبلغین کیلئے اس کتاب سے استفادہ نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ ھدیہ ۶ روپے صرف

○ **یادِ شہید** "یادِ شہید میں مصنف نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے سوانح حیات اور سانحہ کربلا کی مختصر تاریخ مستند حوالوں کی مدد سے مرتب کی ہے اور آخر میں اس سانحۂ عظیم کے اسباب و محرکات پر بحث کی ہے اور مختلف مکاتب فکر کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔ مصنف نے واقعات کی صحت اور دلائل میں توازن برقرار رکھا ہے اور اپنے آپ کو کہیں بھی افراط و تفریط یا جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اس اعتبار سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔"
قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے
تبصرہ روزنامہ امروز ۱۹ جولائی ۵۹ء

○ **تحقیق قربانی** مسئلہ قربانی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے والی معرکۃ الآرا کتاب، قربانی کے موضوع پر پہلی جامع معیاری اور فیصلہ کن تصنیف
قیمت مجلد ۲ روپے

دائرۃ المصنفین

مبارک سنز سٹیشنرز ۸ اردو بازار — لاہور